رمز و کنایات

فراق گورکھپوری

بار اوّل .... دو ہزار

سنگم پبلشنگ ہاؤس - الہ آباد

سنہ ۱۹۴۷ء

مطبوعہ سلیمی برقی پریس - الہ آباد

۱

سنہ ۱۹۳۷ء

نگاہِ ناز نے پردے اُٹھائے ہیں کیا کیا!
حجاب اہلِ محبت کو آئے ہیں کیا کیا!

جہاں میں تھی بس اک افواہ تیرے جلووں کی
چراغِ دیر و حرم جھلملائے ہیں کیا کیا!

دوچار برقِ تجلی سے رہنے والوں نے
فریب نرم نگاہی کے کھائے ہیں کیا کیا!

دلوں پہ کرتے ہوئے آج آتی جاتی چوٹ
تری نگاہ نے پہلو بچائے ہیں کیا کیا!
نثارِ نرگسِ میگوں کہ آج پیمانے
لبوں تک آتے ہوئے تھرتھرائے ہیں کیا کیا!
وہ اک ذرا سی جھلک برقِ کم نگاہی کی
جگر کے زخمِ نہاں مُسکرائے ہیں کیا کیا!
چراغِ طور جلے آئینہ در آئینہ
حجابِ برقِ ادا نے اُٹھائے ہیں کیا کیا!
بقدرِ ذوقِ نظر دیدِ حُسن کیا ہو۔ مگر
نگاہِ شوق میں جلوے سمائے ہیں کیا کیا!

کہیں چراغ، کہیں گل، کہیں دلِ برباد

خرامِ ناز نے فتنے اُٹھائے ہیں کیا کیا!

تغافل اور بڑھا اُس غزالِ رعنا کا

فسونِ غم نے بھی جادو جگائے ہیں کیا کیا!

ہزار فتنۂ بیدار خوابِ رنگیں میں

چمن میں غنچۂ گل رنگ لائے ہیں کیا کیا!

ترے خلوصِ نہاں کا تو آہ کیا کہنا!

سلوک اُچٹے بھی دل میں سمائے ہیں کیا کیا!

نظر بچا کے ترے عشوہ ہائے پنہاں نے

دلوں میں دردِ محبت اُٹھائے ہیں کیا کیا!

پیامِ حسن، پیامِ جنوں، پیامِ فنا
تری نگہہ نے فسانے سُنائے ہیں کیا کیا!
تمام حُسن کے جلوے تمام محرومی
بھرم نگاہ نے اپنے گنوائے ہیں کیا کیا!
فراقؔ راہِ وفا میں سُبک روی تیری
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا!

۲

سنہ ۱۹۲۵ء

میں ہوشِ عنادل ہوں مشکل ہے سنبھل جانا
"اے بادِ صبا میری کروٹ تو بدل جانا"
تقدیرِ محبت ہوں مشکل ہے بدل جانا
سو بار سنبھل کر بھی معلوم سنبھل جانا
اُس آنکھ کی مستی ہوں اے بادہ کشو جس کا
اُٹھ کر سرِ میخانہ ممکن ہے بدل جانا

ایّامِ بہاراں میں دیوانوں کے تیور بھی

جس سمت نظر اُٹھی عالم کا بدل جانا

گھنگھور گھٹاؤں میں سرشار فضاؤں میں

مخمور ہواؤں میں مشکل ہے سنبھل جانا

ہوں لغزشِ مستانہ میخانۂ عالم میں

برقِ نگہِ ساقی کچھ بچ کے نکل جانا

اِس گلشنِ ہستی میں کم کھلتے ہیں گُل ایسے

دُنیا مہک اُٹھے گی تم دل کو مَسل جانا

میں سازِ حقیقت میں سویا ہوا نغمہ تھا

تھا رازِ نہاں کوئی پردوں سے نکل جانا

ہوں نکہتِ مستانہ گلزارِ محبت میں
مدہوشیِ عالم ہے پہلو کا بدل جانا
مستی میں لگاوٹ سے اُس آنکھ کا یہ کہنا
میخوار کی نیت ہوں ممکن ہے بدل جانا
جو طرزِ غزل گوئی مومنؔ نے طرح کی تھی
صد حیف فراقؔ اُس کا صد حیف بدل جانا

۳

۱۹۳۵ء

تھا تنگ اضطرابِ دلِ بے قرار کا
آنا رُلا گیا مجھے بادِ بہار کا
اُترا ہوا خمار مئے انتظار کا
راز آشنا ہوں میں کسی غفلت شعار کا
سازِ مجاز کی میں صدائے شکست ہوں
خمیازہ کش ہوں ہستیِ ناپائدار کا

بسمل فراقِ صبح ازل سے ہے ہر سحر
عالم تو دیکھ پیرہنِ تار تار کا

کوتاہیِ نصیبِ جنوں کچھ نہ پوچھئے
ہاتھوں میں آچکا تھا گریباں بہار کا

اک تیرے دردِ عشق نے بدلے ہیں کتنے بھیس
اچھا بہانہ ہے یہ غمِ روزگار کا

اب عشق ماورائے نشاط و ملال ہے
کچھ اضطرابِ دید نہ غم انتظار کا

مارا ہے کس ادا سے دلِ سوگوار کو
کشتہ ہوں تیری پرسشِ بیگانہ وار کا

وہ آنکھ اپنے کام سے غافل نہیں فراقؔ
کچھ دیر رہ والے ہوش ہر اک ہوشیار کا
پردے حریمِ ناز کے گرتے چلے فراقؔ
اُٹھتا چلا ہے دردِ دلِ بے قرار کا

۴

سنہ ۱۹۲۶ء

رات آدھی سے زیادہ گئی تھی سارا عالم سوتا تھا
نام ترا لے لے کر کوئی درد کا مارا روتا تھا

چارہ گرو یہ تسکیں کیسی! میں بھی ہوں اس دنیا میں
اُن کے ایسا درد کب اُٹھا جن کو بچنا ہوتا تھا

کچھ کا کچھ کہہ جاتا تھا میں فرقت کی بیتابی میں
سننے والے ہنس پڑتے تھے ہوش مجھے تب ہوتا تھا

تارے اکثر ڈوب چلے تھے رات کے رونے والونکو
آنے لگی تھی نیند سی کچھ دنیا میں سویرا ہوتا تھا

ترکِ محبت کرنے والو! کون ایسا جگ جیت لیا
عشق سے پہلے کے دن سوچو کون بڑا سکھ ہوتا تھا

دُنیا دنیا غفلت طاری، عالم عالم بے خبری
حُسن کا جادو کون جگائے ایک زمانہ سوتا تھا

اُس کے آنسو کس نے دیکھے اُس کی آہیں کس نے سنیں؟
چمن چمن تھا حُسن بھی لیکن دریا دریا روتا تھا

پچھلا پہر تھا ہجر کی شب کا جاگتا رب سوتا سنسار
تاروں کی چھاؤں میں کوئی فراقؔ سا جیسے موتی پروتا تھا

۵

سنہ ۱۹۳۷ء

خود نما ہو کے نہاں۔ چھپ کے نمایاں ہونا
الغرض حُسن کو رسوا کسی عنواں ہونا
کبھی صحرا کبھی گلشن کبھی زنداں ہونا
کبھی کونین کو میرا ہی گریباں ہونا
یوں تو اکسیر ہے خاکِ درِ جاناں لیکن
کاوشِ غم سے اُسے گردشِ دَوراں ہونا
حدِّ تمکیں سے نہ باہر ہوئی خود دارِ نگاہ
آج تک آ نہ سکا حُسن کو حیراں ہونا

چارہ گر درد سراپا ہوں مرے درد نہیں
باور آیا اب تجھے نشتر کا رگِ جاں ہونا

مجھ سے بچنا ہی ترا ٹھیک ہے اے دامنِ دوست
میرے غم کو ہے فقط میرا گریباں ہونا

دفترِ رازِ محبت تھا ملالِ دل پر
وہ سکوتِ نگہِ ناز کا پرساں ہونا

اب تو مجھ کو بھی مرے درد کا احساس نہیں
مشکلِ عشق مبارک تجھے آساں ہونا

رشکِ صد لطف و کرم ہے یہ نیا رنگِ ستم
کچھ ہمیں جان سکے تیرا پشیماں ہونا

اپنا انجام اگر عشق سمجھتا ہے تو پھر
حُسن کا کس لئے شرمندۂ احساں ہونا

اب تو تنگ آ گئے اِس کشمکشِ پنہاں سے
دل کے شیرازہ کو آیا نہ پریشاں ہونا

سازِ بے سوز سے دنیا نہیں بدلا کرتی
کارِ ہر نعرہ نہیں نعرۂ مستاں ہونا

وحشتِ عشق کا بڑھنا تو عدم ہو جاتا
سمٹ آنا تو سراپردۂ امکاں ہونا

سربسر برقِ فنا عشق کے جلوے ہیں فراقؔ
خانۂ دل کو نہ آباد نہ ویراں ہونا

۶

سنہ ۱۹۳۷ء

ہے ابھی جوہرِ ہستی کو نمایاں ہونا
ابھی فطرت کو ہے آئینۂ انساں ہونا
سربسر جسم کے امکان میں ہے جاں ہونا
رگِ ہستی کو نہ آیا ابھی لرزاں ہونا
سازِ بے سوز ہے اے عشق یہ افسردہ حیات
دل کے پردوں کو سکھا شعلہ بداماں ہونا
رازِ سربستہ ہے شیرازۂ دل کی ترکیب
بہ یک انداز اسے یک جا و پریشاں ہونا

دلِ سوزاں شبِ غم پیکرِ بے خبری ہے
نہ شبستاں نہ اِسے شمعِ شبستاں ہونا

ہم تو درماں کو بھی درد بنا لیتے ہیں
یوں تو اے درد مبارک تجھے درماں ہونا

بات یہ ہے کہ میں ناشاد بھی ہوں شاد بھی ہوں
عقدۂ عشق کو دشوار نہ آساں ہونا

ذرّہ اپنا بھی ہے خورشیدِ قیامت لیکن
مجھے منظور نہیں چاک گریباں ہونا

وہ سیہ کارِ محبت ہوں میں واعظ کہ مجھے
قبلۂ دیں تو کبھی کعبۂ ایماں ہونا

دیکھ آشفتگیِ دہر نہ دیکھا ہو اگر
گیسوئے شاہدِ رعنا کا پریشاں ہونا

کس طرح عشق کی مشکل کو کوئی سہل کرے
جس کے آساں کو بھی آیا نہیں آساں ہونا

نزع میں دادِ وفا دِل گئی بیماروں کو
سر بسر حُسن کا تاخیرِ پشیماں ہونا

ہم ترے حُور و پری ہونے سے مسرور نہیں
ہمیں درکار ہے انسان کا انساں ہونا

اور عالم ہے مری وادیِ وحشت کا فراق
اسے زنداں نہ بیاباں نہ گلستاں ہونا

۷

سنہ ۱۹۳۷ء

چاک دل، چاک جگر، چاک گریباں ہونا
وحشیو، یہ تو نہیں عاشقِ جاناں ہونا

تجھے دیکھا بھی تو اِس طرح کہ دیکھا ہی نہیں
ترا سرتا بہ قدم عشوۂ پنہاں ہونا

دُکھتے دل کو نئے انداز سے دکھنا آیا
غمِ دوراں کو مبارک غمِ جاناں ہونا

فرشِ رہ دیدۂ و دل ہیں ترے مشتاقوں کے
تیری آمد میں کوئی ساز نہ ساماں ہونا

چپّے چپّے میں ہے گلزار کے صد دشتِ جنوں
ذرّے ذرّے سے ٹپکتا ہے بیاباں ہونا

ٹھوکریں ہیں در و دیوار کی اور تیرے اسیر
سخت دشوار ہے شائستۂ زنداں ہونا

خود کو پہچان سکی دُکھ بھری دُنیا نہ ابھی
غمِ انساں کو نہ آیا غمِ انساں ہونا

اُف! وہ نیرنگِ جنوں چاک گریبانوں کے
کبھی خنداں، کبھی گریاں، کبھی حیراں ہونا

اِسے جو کچھ کوئی سمجھے اِسے جو کچھ جانے
غمِ جاناں کو مگر کفر نہ ایماں ہونا
نگہِ شوخ نے چھیڑا ہے رگِ سازِ مجاز
دیکھ اب حسنِ حقیقت کا نمایاں ہونا
ہیں امیدیں بھی تغافل سے ترے یوں تو اُسے
مرا ہمراز، نہ دمساز نہ پرساں ہونا
کتنی بے لاگ لگاوٹ نگہِ ناز کی تھی
یوں ملی جیسے اسے درد نہ درماں ہونا
آج در پردہ جنوں سلسلہ جنباں ہے فراقؔ
کھل گیا گیسوئے پُرخم کا پریشاں ہونا

۸

۱۹۳۸ء

نکل چلا تھا مگر حُسن بے حجاب نہ تھا

ابھی شباب کا آغاز تھا شباب نہ تھا

وہ میکدہ تھا کہ جس کا کوئی جواب نہ تھا

حریفِ رندِ سیہ مست آفتاب نہ تھا

کہیں یہی نہ ہو آغازِ ربطِ پنہاں کا

تری نگاہ میں پہلے تو یہ حجاب نہ تھا

کہیں یہی نہ ہو اعجازِ کارسازیِ عشق

اُسی کا کام بنا کچھ جو کامیاب نہ تھا

کہیں نہ کیف و اثر تھا نہ تھا پتہ اپنا
حریم عشق میں خود عشق باریاب نہ تھا

زہے یہ تمکنتِ حسن و کیف سرمستی
چھلکنے کے لئے پیمانۂ شباب نہ تھا

سکوتِ ناز کو بیگانگی سمجھ بیٹھے
سوالِ دل ابھی شائستۂ جواب نہ تھا

تجھے خبر ہے کہ رات ان نگاہِ مست ہر ایک
خراب ہو کے بھی تیری طرح خراب نہ تھا

بڑھا رہا ہے کوئی رسم و راہ کیا دل سے
سپردگی کی ادا میں یہ اجتناب نہ تھا

یہ موت خوبیِ تقدیرِ عشق ہے ورنہ
عذابِ غم کا بھی ایسا کوئی عذاب نہ تھا

ہوا جو خوفِ سزا جرمِ عاشقی سنگیں
عتاب تھا، مگر اتنا اُسے عتاب نہ تھا

بس اک نظر سے جنوں کو بنا لیا مانوس
یہ رنگِ حُسن تو پردہ حجاب نہ تھا

حریمِ یار میں خاصانِ عشق تھے ہم لوگ
وہ کون فردِ بشر تھا جو انتخاب نہ تھا

وفورِ بے خودیِ بزمِ ناز کیا کہئے
کہ باریاب بھی جو تھا وہ باریاب نہ تھا

شکایتوں پہ سکوتِ زباں دراز نہ پوچھ
کہ لاجواب بھی ہو کر وہ لاجواب نہ تھا

کہیں وہی تو گریباں نہیں ہے آج اپنا
ترا وہ گوشۂ دامن جو دستیاب نہ تھا

تمام کشمکشِ دہر ایک غفلت تھی
کھلی جو آنکھ فضا میں وہ اضطراب نہ تھا

نہ جانے کیوں بھری دنیا میں خاک اڑتی ہے
بہ فیضِ عشق یہ دریا ابھی سراب نہ تھا

فراقؔ یاد کر ایسا بھی کوئی عالمِ عشق
جو ایک شب کا فسانہ نہ تھا جو خواب نہ تھا

۹

سنہ ۱۹۳۷ء

دورِ آغازِ جفا دل کا سہارا نکلا
حوصلہ کچھ نہ ہمارا نہ تمھارا نکلا

تیرا نام آتے ہی سکتے کا تھا عالم مجھ پر
جانے کس طرح یہ مذکور دوبارا نکلا

ہوش جاتا ہے جگر جاتا ہے دل جاتا ہے
پردے ہی پردے میں کیا تیرا اشارا نکلا

ہے ترے کشف و کرامات کی دنیا قائل

تجھ سے اے دل نہ مگر کام ہمارا نکلا

کتنے سفاک سرِ قتل گہِ عالم تھے

لاکھوں میں بس وہی اللہ کا پیارا نکلا

عبرت انگیز ہے کیا اُس کی جواں مرگی بھی

ہائے وہ دل جو ہمارا نہ تمھارا نکلا

عشق کی لَو سے فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں

رشکِ خورشیدِ قیامت یہ شرارا نکلا

سر بسر بے سر و ساماں جسے سمجھے تھے وہ دل

رشکِ جمشید و کَے و خسرو و دارا نکلا

روئے والے ہوئے چُپ ہجر کی دنیا بدلی
شمع بے نور ہوئی صبح کا تارا نکلا
اُنگلیاں اُٹھیں فراقؔ وطن آوارہ پہ
آج جس سمت سے وہ درد کا مارا نکلا

۱۰

سنہ ۱۹۲۴ء

کچھ بُو سی اُڑ رہی ہے یہ مستانہ وار کیا
چڑکا چمن میں شیشۂ ابرِ بہار کیا

اپنی نظر کا تجھ کو نہیں اعتبار کیا
یہ بار بار پرسشِ بیگانہ وار کیا

تقلیدِ رسمِ جامہ دری سے بھی ہاتھ اُٹھا
خود کو مٹا دے پیرہنِ تار تار کیا

پیمانۂ حیات ہے اک جامِ بے خودی

یہ جس کے منھ لگا وہ رہے ہوشیار کیا

کوئی جواب دے تو خطاب و عتاب کر

اک بے زباں کی سرزنش بار بار کیا

رنگینیِ فضا ہے ترا عشوۂ حجاب

ہوتا ہے اور جلوۂ صبحِ بہار کیا

دردِ فراق وجہ سکوں کب ہوا اگر

امید ہی نہ ہو تو رہیں بے قرار کیا

رگ رگ میں آج دوڑ گئیں بجلیاں **فراق**

ہو اور شرمگیں نگہہ شرمسار کیا

۱۱

سنہ ۱۹۲۴ء

دار و رسن کا گھٹنے کو ہے اعتبار کیا
کہتا چلا اُدھر کوئی مستانہ وار کیا
ہو عشقِ سرنگوں سے بھی کوئی دوچار کیا
سچ ہے نگاہِ شوق کا بھی اعتبار کیا
ہستی کے بند بند جُدا ہو کے رہ گئے
دل پر پڑی تری نگہِ بے قرار کیا

بجھ بجھ کے داغِ دل اُبھر آتے ہیں ہم نوا
مجھ قیدیِ قفس کی خزاں کیا بہار کیا

کچھ رنگ سا فضائے ٹپکتا ہے اے جنوں
چھلکا ہوا ہے شیشۂ بادِ بہار کیا

بیٹھے بٹھائے چھیڑ دیا نازِ یار کو
یہ تو نے کر دیا دلِ ناکردہ کار کیا

اے دل کسی کی پہلی نگاہوں کو بھول جا
یاد آ گیا تجھے مرے غفلت شعار کیا

سب چھوڑ ہی چکے تھے بھروسا مرا فراقؔ
لو وہ بھی کہتے ہیں کہ ترا اعتبار کیا

مُنہ پھیر کر فراقؔ وہ کچھ مسکرا دیئے
سنتے اب اور حالِ دلِ بے قرار کیا

دوریِ یار کا بھی غم ایسوں کے ملنے کا بھی غم
جن کو قریب پا کے جی اور اُداس ہو گیا

معصوم ہے محبت لیکن اسی کے ہاتھوں
یہ بھی ہوا کہ میں نے تیرا بُرا بھی چاہا

۱۲

۱۹۲۲ء

طُور تھا، کعبہ تھا، دل تھا جلوہ زارِ یار تھا
عشق سب کچھ تھا مگر پھر عالمِ اسرار تھا
نشۂ صد جام کیفِ انتظارِ یار تھا
ہجر میں ٹھہرا ہوا دل ساغرِ سرشار تھا
اک ادائے بے نیازِ قرب و دُوری کر دیا
ماورائے وصل و ہجراں حسن کا اقرار تھا

اے جنوں ہم تو دیارِ عشق میں کھوئے گئے
ہوش اتنا بھی نہیں کیا رنگ بوئے یار تھا

مدتیں گزریں فریبِ غم کو بھی کھائے ہوئے
یاد اتنا بھی نہیں جینے سے کیوں بیزار تھا

عہدِ الفت یوں نہ پورا ہو، یہ ہے قسمت کی بات
تم ہو یا میں ۔کب کوئی شبہہ تھا کب انکار تھا

اُف سکونِ یاس کو بھی ناشکیبا کر دیا
آج کتنا شوخ اُس کا وعدۂ دیدار تھا

جوہرِ آئینۂ عالم بنے آنسو مرے
یوں تو یہ سچ ہے کہ رونا عشق میں بیکار تھا

حسن کا بھی آخر شش ٹوٹا طلسمِ رنگ و بو

خارزارِ عشق ناداں رشکِ صد گلزار تھا

مجھ کو تو صبحِ ازل صبحِ قیامت ہو گئی

حشرِ وعدہ بھی بس اک رمزِ نگاہِ یار تھا

نسبت ان آنکھوں سے بھولوں یا درکھوں جامِ مے

کب میں اتنا بے خبر کب اس قدر ہشیار تھا

شوخیِ رفتار وجہِ ہستیِ برباد تھی

زندگی کیا تھی غبارِ رہگذارِ یار تھا

اس حریمِ راز میں چونکی نگاہِ عشق بھی

ہنس رہا تھا حسن میں شرمندۂ دیدار تھا

الفتِ دیرینہ کا جب ذکر اشاروں میں کیا
مسکرا کر مجھ سے پوچھا تم کو کن سے پیار تھا

دل دُکھے روئے ہیں شاید اس جگہہ اے کوئی دوست
خاک کا اتنا چمک جانا ذرا دشوار تھا

الوداع اے بزمِ انجم ہجر کی شب الفراق
تا بہ صبحِ ناگہانی انتظارِ یار تھا

ذرّہ ذرّہ آئینہ تھا خود نمائی کا فراقؔ
سر بسر صحرائے عالم جلوہ زارِ یار تھا

۱۳

سنہ ۱۹۳۷ء

عشقِ دیوانہ اگر چاکِ گریباں ہوتا

پھر نہ زنداں، نہ بیاباں، نہ گلستاں ہوتا

دیکھ لیتے کہ نہ غمگین، نہ شاداں ہوتا

عشق بڑھتا تو نہ پھر درد نہ درماں ہوتا

دلِ سوزاں میں نہ افسردگیِ یاس آتی

نہ یہ عالم ہی سیہ شمعِ شبستاں ہوتا

شورِ عالم جو ہم آہنگِ جنوں ہو جاتا
پھر یہ ہنگامہ بھی اک خوابِ پریشاں ہوتا

زخمِ پنہاں سے اگر اذنِ جنوں پا جاتا
یہی دل رشکِ چمن رشکِ بیاباں ہوتا

پینے والے ہی نہیں ورنہ وہ ساغر چلتے
جن کا ہر دَور لئے گردشِ دوراں ہوتا

شوخیٔ حسن ہو یا مصلحتِ عشق کوئی!
ورنہ میں اور خرابِ غمِ دوراں ہوتا

دلِ مظلوم کی حسرت تو بجا ہے لیکن
جانتا کون جو وہ شوخ پشیماں ہوتا

حُسن پھر حُسن ہے کچھ پرسشِ غم کی حد بھی
عشق پھر عشق ہے کس بات پہ شاداں ہوتا

فتنہ ساماں ہے دلِ بے سر و ساماں ورنہ
حسن کے پاس کوئی ساز نہ ساماں ہوتا

بچ گیا بخیۂ دیوانہ سے دامانِ بہار
ہاتھ پڑتے تو عجب رنگِ گلستاں ہوتا

مے تو مے نشۂ مے پی گئے تیرے بدمست
آگ لگ جاتی اگر شوقِ چراغاں ہوتا

مد و جزر ایک ہی طوفاں کے ہیں یہ مستی و ہوش
عشق اگر کفر نہ ہوتا تو پھر ایماں ہوتا

کاش آفاق کے اس شرح و بیاں کے بدلے
تجھے آفاق بدل دینے کا ارماں ہوتا

ہو گیا چشمِ عدم سے بھی نہاں ناوکِ ناز
ابھی حسرت ہے کہ پیوستِ رگِ جاں ہوتا

میں تری چارہ گری کو نہیں کہتا، لیکن
چارہ گر دردِ نہاں کا نہیں درماں ہوتا

دیکھ کر بے کسیِ عشق کوئی اور فراقؔ
نہ سہی میں ہی شریکِ غمِ ہجراں ہوتا

۱۴

سنہ ۱۹۳۶ء

ہجر و وصالِ یار کا پردہ اُٹھا دیا
خود بڑھ کے عشق نے مجھے میرا پتا دیا
گردِ غبارِ ہستیِ فانی اُڑا دیا
اے کیمیائے عشق مجھے کیا بنا دیا
وہ سامنے ہے اور نظر سے چھپا دیا
اے عشقِ بے حجاب مجھے کیا دکھا دیا

وہ شانِ خامشی کہ بہاریں ہیں منتظر
وہ رنگِ گفتگو کہ گلستاں کھلا دیا

دم لے رہی تھیں حسن کی جب سحرکاریاں
اُن وقفہ ہائے کفر کو ایماں بنا دیا

معلوم کچھ مجھی کو ہیں ان کی روانیاں
جن قطرہ ہائے اشک کو دریا بنا دیا

اک برقِ بے قرار تھی تمکینِ حُسن بھی
جس وقت عشق کو غمِ صبر آزما دیا

ساقی مجھے بھی یاد ہیں وہ تشنہ کامیاں
جن کو حریفِ ساغر و مینا بنا دیا

معلوم ہے حقیقتِ غمہائے روزگار
دُنیا کو تیرے درد نے دُنیا بنا دیا
اے شوخیٔ نگاہِ کرم مدّتوں کے بعد
خوابِ گرانِ غم سے مجھے کیوں جگا دیا
کچھ شورشیں تغافلِ پنہاں میں تھیں جنھیں
ہنگامہ زارِ حشرِ تمنا بنا دیا
بڑھتا ہی جا رہا ہے جمالِ نظر فریب
حسنِ نظر کو حُسنِ خود آرا بنا دیا
پھر دیکھنا نگاہ لڑی کس سے عشق کی
گر حُسن نے حجابِ تغافل اُٹھا دیا

جب خون ہو چکا دلِ ہستیِ اعتبار
کچھ درد بچ رہے ہیں جنھیں انساں بنا دیا
گُم کردہ دُودِ غمِ انتظار ہوں
تو کیا چھپا کہ مجھ کو مجھی سے چھپا دیا
رات اب حریفِ صبحِ قیامت ہی کیوں نہ ہو
جو کچھ بھی ہو اس آنکھ کو اب تو جگا دیا
اب میں ہوں اور لطف و کرم کے تکلّفات
یہ کیوں حجابِ رنجشِ بیجا بنا دیا
تھی یوں تو شامِ ہجر مگر پچھلی رات کو
وہ درد اُٹھا فراقؔ کہ میں مسکرا دیا

۱۵

سنہ ۱۹۲۶ء

ہر شکوۂ ناروا کو دیکھا
اے عشق تری وفا کو دیکھا
اے جوشِ جنوں کٹا نہ صحرا
تجھ سے نہ دورِ آزما کو دیکھا
ہستیِ عدم نما کے صدقے
چھپتے ہوئے برملا کو دیکھا
دام اُٹھے نہ کیمیائے دل کے
اس جنسِ گراں بہا کو دیکھا

تقدیر سے اب نہیں شکایت

اے دوست تری جفا کو دیکھا

دیکھے کوئی جیسے جاگتا خواب

حسنِ نازک لقا کو دیکھا

اے دردِ فراق اے غمِ دوست

عشقِ صبر آزما کو دیکھا

تار دل کے قلوب جیسے دھڑکیں

رات اُس کی ادا ادا کو دیکھا

ہم نے بھی فراق جان دے کے

اُس ناوکِ بے خطا کو دیکھا

۱۶

سنہ ۱۹۲۶ء

اک جلوۂ حق نما کو دیکھا
تم کو دیکھا، خدا کو دیکھا

ہر چیز میں شانِ نیستی ہے
عدم ہستی نما کو دیکھا

موسیٰ کے بھی دم اُکھڑ چلے تھے
حُسنِ نازک ادا کو دیکھا

اللہ ری شمیم جسم گلگوں
غش کھاتے ہوئے صبا کو دیکھا

محشر کی بھی راہ دیکھ لیں گے
تجھ سے صبر آزما کو دیکھا
مُنھ پھیر کے اِدھر سے جانے والے
مجھ پر قہرِ خدا کو دیکھا
ہم نے بھی خدا سے موت مانگی
ہم نے بھی تری جفا کو دیکھا
تیری وہی سرگرانیاں ہیں
ہم نے اپنی وفا کو دیکھا
ہم نے بھی سنا فراقؔ کا حال
ہم نے بھی تری جفا کو دیکھا

۱۷

۱۹۳۶ء

میکدے میں آج اک دنیا کو اِذنِ عام تھا
دَورِ جامِ بے خودی بیگانۂ ایام تھا
رُوح لرزاں، آنکھ محوِ دیدۂ دل ناکام تھا
عشق کا آغاز بھی شائستۂ انجام تھا
رفتہ رفتہ عشق کو تصویرِ غم کر ہی دیا
حسن بھی کتنا خرابِ گردشِ ایام تھا

غم کدے میں دہر کے یوں تو اندھیرا تھا مگر
عشق کا داغِ سیہ بختی چراغِ شام تھا

تیری دزدیدہ نگاہی یوں تو نامحسوس تھی
ہاں مگر دفتر کا دفتر حسن کا پیغام تھا

شاق اہلِ شوق پر تھیں اس کی عصمت داریاں
سچ ہے، لیکن حُسن در پردہ بہت بدنام تھا

محو تھے گلزارِ رنگا رنگ کے نقش و نگار
وحشتیں تھیں، دل کے سناٹے تھے، دشتِ شام تھا

بے خطا تھا حُسن ہر جور و جفا کے بعد بھی
عشق کے سر تا ابد الزام ہی الزام تھا

یوں گریباں چاک دنیا میں نہیں ہوتا کوئی
ہر کھلا گلشن شہیدِ گردشِ ایام تھا

دیکھ حسنِ شرمگیں در پردہ کیا لایا ہے رنگ
عشق رسوائے جہاں بدنام ہی بدنام تھا

رونقِ بزمِ جہاں تھا گو دلِ غمگیں فراقؔ
سرد تھا، افسردہ تھا، محروم تھا، ناکام تھا

تمھیں پا کر بھی کیوں رہتی شکایت کس مپرسی کی
مرے تم ہو گئے مجھ کو بھی گر اپنا بنا لیتے

۱۸

سنہ ۱۹۲۱ء

کارگرِ عشق میں اب تک غمِ پنہاں نہ ہوا
میں ابھی بے خبرِ کلفتِ ہجراں نہ ہوا
بارِ لغ دشت لوزدی مجھے زنداں نہ ہوا
در و دیوار سے کچھ ہوش کا ساماں نہ ہوا
باغ میں بادِ صبا بھیجنے والے ہر صبح
ہم اسیرانِ قفس پر کبھی احساں نہ ہوا

نگہہِ ناز ہے اور اہلِ ہوس کے دل ہیں
ہائے وہ تیر جو پیوستِ رگِ جاں نہ ہوا

دشتِ غربت میں پریشاں نہیں دل تنگ نہیں
ابھی دیوانہ ترا قابلِ زنداں نہ ہوا

ہم نے دیکھا ہے وہ اندازِ جنوں بھی جو کبھی
چاکِ دل، چاکِ جگر، چاکِ گریباں نہ ہوا!

رنگ کو حسرتِ پرواز ابھی باقی ہے
عالمِ نکہتِ برباد گلستاں نہ ہوا

دار سے اٹھتا ہے اک نعرۂ مستانہ ہنوز
ہائے وہ درد جو شرمندۂ درماں نہ ہوا

ہاں بجھا دے دلِ سوزاں کو مگر تو جانے

بزمِ ہستی میں جو یہ سوختہ ساماں نہ ہوا

خوبیاں تجھ میں ہیں اے عشق زمانے بھر کی

یہ تو کچھ دعویٰ ہمتائی خوباں نہ ہوا

حسنِ گلزار سے دل چاک ہوا جاتا ہے

جوشِ گل چارہ گرِ تنگیِ داماں نہ ہوا

سر حدیں جلوہ گہِ ناز سے جس کی نہ ملیں

وہ تو اک کھیل ہوا چاک گریباں نہ ہوا

کہتی ہے وصل کی شب وہ نگہِ خواب آلود

ختم ابھی قصۂ بیتابیِ ہجراں نہ ہوا

آج تک صبحِ ازل سے وہی سناٹا ہے

عشق کا گھر کبھی شرمندۂ مہماں نہ ہوا

زندگی کیا وہ ترے غم سے جو دن تنگ نہیں

کیا وہ شیرازۂ ہستی جو پریشاں نہ ہوا

اہلِ زنداں کا یہ مجمع ہے ثبوت اس کا فراق

کہ بکھر کر بھی یہ شیرازہ پریشاں نہ ہوا[1]

وصال کو بھی بنا دے جو عین دردِ فراق

ہی سے چھوٹنے کا غم سہا نہیں جاتا

[1] یہ غزل آگرہ جیل کے مشاعرہ میں پڑھی گئی۔

۱۹

سنہ ۱۹۳۰ء

ماتمِ عشق سرِ چرخِ بریں دیکھ لیا
شامِ غم ہم نے ترا خونِ جبیں دیکھ لیا
بزم اُلٹ جائے گی ساقی جو ترے ہاتھوں سے
جام رندوں نے چھلک جاتے کہیں دیکھ لیا
تیر آہوں نے وہ مارے ہیں کہ تاثیر کو بھی
کر دئیں لیتے سرِ عرشِ بریں دیکھ لیا

مئے سر جوشِ تجلّی کو چھلکتے واعظ
ہم نے ساقی کی اداؤں کے قریں دیکھ لیا
وہم میں بھی جو نہ آتے تھے وہ شبخوں کر جائیں
چوٹ اُبھری کہ گلِ شمعِ یقیں دیکھ لیا
دھنس گئی گورِ غریباں کی زمیں کس نے یہاں
آکے کن آنکھوں سے کل سوئے زمیں دیکھ لیا
کر کے خم گردنِ تسلیم کو معصوموں نے
دیکھ لی تیغِ ستم خنجرِ کیں دیکھ لیا
کون ہر سو سرِ شوریدہ لئے پھرتا تھا
اے فراق آج تمھیں گوشہ نشیں دیکھ لیا

۲۰

سنہ ۱۹۳۷ء

ہو کے سر تا بقدم عالمِ اسرار چلا
جو چلا میکدۂ عشق سے سرشار چلا
ہمرہِ حسن اک انبوہِ خریدار چلا
ساتھ اس جنس کے بازار کا بازار چلا
اس سے تو قید ہی اچھی تھی کہ چھُٹ کے ہر اسیر
لے کے آشفتگیِ گیسوئے خمدار چلا

ہوش اُڑے جاتے ہیں ساقی یونہی میخواروں کے
جادوئے چشمِ سیہ کار نہ زنہار چلا
یہ اشاراتِ نہاں اہلِ ہوس کیا سمجھیں
ایسوں میں تذکرۂ عشق نہ بیکار چلا
لی ہے خود صبح نے انگڑائی خمار آلودہ
رات وہ دَورِ مئے ساغرِ سرشار چلا
نہ ہوا راہِ محبت میں کوئی عہدہ برآ
جو سبکدوش ہوا ابھی وہ گراں بار چلا
یوں تو کیا کہنا تری بزم کا جس سے ہر ایک
چار و ناچار چلا بیدل و بیزار چلا

اُن کا جو حال کہ پہلے تھا وہی حال رہا
تیرے غم کشتوں سے اقرار نہ انکار چلا

شوخیِ حسن سلامت، تجھے شمشیر سے کیا
یہ چمکتی ہوئی چلتی ہوئی تلوار چلا

وہ سکوں پوچھ نہ کیا تھا شبِ غم جب دل سے
عشق خود اپنے مٹاتا ہوا آثار چلا

خونِ حسرت کا شہید وفا کھلا رنگ اس وقت
جب اُٹھائے ہوئے وہ دامنِ گلنار چلا

قید سے چھوٹ کے بھی دل تنگ رہا تیرا اسیر
سوئے صحرا لیئے رنجِ در و دیوار چلا

آسماں ہو کہ قیامت ہو کہ ہو تیرِ قضا
چال اس فتنۂ دوراں سے ہر اک ہار چلا

بے نیازانِ محبت کو تھے وہ زعم کہ بس
خیر اتنا تو ہوا جو بھی تھا سر مار چلا

ذوقِ نظارہ اُسی کا ہے جہاں میں تجھ کو
دیکھ کر بھی جو لئے حسرتِ دیدار چلا

تیرے وارفتۂ غم ہوش میں آتے ہی نہیں
ان پر اب کچھ عملِ نرگسِ بیمار چلا

حسن کافر سے کسی کی نہ گئی پیش فراقؔ
شکوہ یاروں کا نہ شکرانۂ اغیار چلا

۲۱

سنہ ۱۹۳۸ء

عشق فسردہ ہی رہا غم نے جلا دیا تو کیا
سوزِ جگر بڑھا تو کیا دل سے دھواں اٹھا تو کیا

پھر بھی رگوں میں عشق کی حُسن کی وہ کسک کہاں
ہر دلِ بے قرار میں درد دبا دیا تو کیا

پھر بھی تو شبنمی ہے آنکھ پھر بھی تو ہونٹ خشک ہیں
زخم جگر ہنسا تو کیا غنچۂ دل کھلا تو کیا

پھر بھی تو بے خودانِ غمِ رازِ سکوں نہ پا سکے
تو نے نظر کی لوریاں دے کے سلا دیا تو کیا

پھر بھی مری صدائے درد تیرے لئے سکوت ہے
ہل گیا آسماں تو کیا کانپ اُٹھی فضا تو کیا

عشق کی غفلتیں نثار چھیڑ نہ اے خیالِ یار
مجلس میں میرے اک جہانِ غم کو جگا دیا تو کیا

کون سا فرق آ گیا گردشِ روزگار میں
اشک ٹپک پڑے تو کیا عشق تڑپ اُٹھا تو کیا

صبر طلسم در طلسم، ضبط فریب در فریب
اشک بھی تھم گیا تو کیا دل بھی سنبھل گیا تو کیا

اور اُلجھ کے رہ گیا قصّہ حیات و موت کا
زلیست کے راز کھولتی بحثِ فنا بقا تو کیا

منزلِ بیخودیِ عشق موت کو بھی نہ مل سکی
جائے گی اتنی دُور تک عمرِ گریز پا تو کیا

دیکھ فضائیں جاگ اُٹھیں زندگی جگمگا اُٹھی
سازِ جنونِ عاشقی چھڑتے ہی سو گیا تو کیا

موجِ فنا کو کشتیاں چیر گئیں۔ کہ دیکھتی
بحر کی بیکرانیاں غفلتِ ناخدا تو کیا

عمرِ دوام مل گئی عالمِ سوز و ساز کو
مجھ کو مٹا دیا تو کیا دل کو بجھا دیا تو کیا

عذرِ ستم کی جان تھی رنجشِ بے سبب تری
جُھک بھی گئی نظر تو کیا آ بھی گئی حیا تو کیا

اب تو تری صدا بھی ہے میری صدائے بازگشت
آج سوالِ عشق پہ آئی بھی اک ندا تو کیا

اور اُداس کر دیا رنگِ سکوتِ ناز نے
وجہِ ملال پوچھتی نرگسِ آشنا تو کیا

دیکھنے والے کو ترے حسرتِ دید رہ گئی
پردہ سا اُٹھ گیا تو کیا نور سا ہو گیا تو کیا

تھیں مری بے قراریاں محرمِ عشوۂ نہاں
ہوش نہ تھے بجا تو کیا دل نہ ٹھکانے تھا تو کیا

وہ تو کسی کا بامِ ناز راہِ جنوں سے مل گیا
کاٹتی یہ چڑھائیاں عقلِ شکستہ پا تو کیا

دیکھ رہا ہوں اور کچھ حسنِ کرشمہ ساز میں
ناز تو کیا ادا تو کیا عشوہ تو کیا حیا تو کیا

سود و زیاں کے لفظ بھی وہم و گماں ہیں سر بسر
حسن بھی پا سکا تو کیا عشق بھی کھو سکا تو کیا

اپنی نگاہ کے فریب رازِ نشاطِ عشق ہیں
دیدۂ شوق بھی ترے حسن کو دیکھتا تو کیا

غربت و گم رہی کا نام کوچہ یار رکھ دیا
گو تھیں تمام منزلیں عشق کے زیرِ پا تو کیا

کوئی مزاج داں نہ تھا گردشِ روزگار کا

حسن تھا شادماں تو کیا عشق اُداس تھا تو کیا

پھر بھی تہِ نظر کی یاد آ ہی گئی فراق کو

بارِ نیاز و نازِ عشق حسن سے اُٹھ سکا تو کیا

بیکار دو دلوں میں ہے ہیچ جواب کا سوال

سرّ ہے کوئی سوال تو عنوانِ شوق سے

۲۲

سنہ ۱۹۳۶ء

جہان غنچۂ دل کا فقط چٹکنا تھا
اسی کی بوئے پریشاں وجود دنیا تھا
یہ کہہ کے کل کوئی بے اختیار روتا تھا
وہ اک نگاہ سہی کیوں کسی کو دیکھا تھا
طنابیں کوچۂ قاتل کی کھنچتی جاتی تھیں
شہیدِ تیغِ ادا میں بھی زور کتنا تھا

بس اک جھلک نظر آئی اُڑے کلیم کے ہوش
بس اک نگاہ ہوئی خاکِ طورِ سینا تھا
ہر اک کے ہاتھ فقط غفلتیں تھیں ہوش نما
کہ اپنے آپ سے بیگانہ وار جینا تھا
یہی ہوا کہ فریبِ امید و یاس مٹے
وہ پا گئے ترے ہاتھوں ہمیں جو پانا تھا
چمن میں غنچۂ گُل کھلکھلا کے مرجھائے
یہی وہ تھے جنھیں ہنس ہنس کے جان دینا تھا
نگاہِ مہر میں جس کی ہیں صد پیامِ فنا
اسی کا عالمِ ایجادِ نازِ بیجا تھا

جہاں تو جلوہ نما تھا لرزتی تھی دنیا
ترے جمال سے کیسا جلال پیدا تھا

حیات و مرگ کے کچھ راز کھل گئے ہونگے
فسانۂ شبِ غم ورنہ دوست کیا تھا

شب عدم کا فسانہ گداز شمع حیات
سوائے کیفِ فنا میرا ماجرا کیا تھا

کچھ ایسی بات نہ تھی تیرا دُور ہو جانا
یہ اور بات کہ رہ رہ کے درد اُٹھتا تھا

نہ پوچھ سود و زیاں کاروبارِ الفت کے
وگرنہ یوں تو نہ پانا تھا کچھ نہ کھونا تھا

لگاوٹیں وہ ترے حسن بے نیاز کی آہ
میں تیری بزم سے جب نا اُمید اٹھا تھا
تجھے ہم اے دلِ درد آشنا کہاں ڈھونڈیں
ہم اپنے ہوش میں کب تھے کوئی جب اٹھا تھا
عدم کا راز صدائے شکستِ سازِ حیات
حجابِ زیست بھی کتنا لطیف پردا تھا
یہ اضطراب سکوں بھی تھے اک فریبِ حیات
کہ اپنے حال سے بیگانہ وار جینا تھا
کہاں یہ چوک ہوئی تیرے بیقراروں سے
زمانہ دوسری کروٹ بدلنے والا تھا

یہ کوئی یاد ہے یہ بھی ہے کوئی محویّت
ترے خیال میں تجھ کو بھی بھول جانا تھا
کہاں کی چوٹ ابھر آئی تھی حسن تاباں میں
دمِ نظارہ وہ رُخ درد سا چمکتا تھا
نہ پوچھ رمز و کنایاتِ چشمِ ساقی کے
بس ایک حشرِ خموش انجمن میں برپا تھا
چمن چمن تھی گلِ داغِ عشق سے ہستی
اسی کی نکہتِ برباد کل زمانہ تھا
وہ تھا مرا دلِ خوں گشتہ جس کے مٹنے سے
بہارِ باغِ جناں تھی وجودِ دنیا تھا

قسم ہے بادہ کشو چشمِ مستِ ساقی کی
تباؤ ہاتھ سے کیا جامِ مے سنبھلتا تھا

وصال اُس سے میں چاہوں کہاں یہ دل میرا
یہ رو رہا ہوں کہ کیوں اُس کو میں نے دیکھا تھا

امید یاس بنی یاس پھر اُمید بنی
اُس اک نظر میں فریبِ نگاہ کتنا تھا

یہ سوز و سازِ نہاں تھا وہ سوز و سازِ عیاں
وصال و ہجر میں بس فرق تھا تو اتنا تھا

شکستِ سازِ چمن تھی بہارِ لالہ و گل
خزاں مچلتی تھی غنچہ جہاں چٹکتا تھا

ہر ایک سانس ہے تجدید "یادِ ایّام"
گذر گیا وہ زمانہ جسے گذرنا تھا

نہ کوئی وعدہ نہ کوئی یقیں نہ کوئی امید
مگر ہمیں تو ترا انتظار کرنا تھا

کسی کے صبر نے بے صبر کر دیا سب کو
فراقؔ نزع میں کروٹ کوئی بدلتا تھا[1]

[1] عین جوانی میں اپنے بڑے بھائی کی موت دیکھ کر یہ شعر کہا تھا۔
فراقؔ

۴۳

سنہ ۱۹۴۰ء

جنت میں آتی ہے قیامت

کھلتے ہیں دوزخ پر درِ رحمت

اتنی شکیبا کب تھی طبیعت

عشق کی ہے اب نازک حالت

تیری صورت تیری محبت

یہ بھی کہانی وہ بھی حکایت

دل کی ٹھنڈک ہے وہی صورت

آگ بھبھوکا، قہر قیامت

خندۂ و گریہ شکر و شکایت
سب سے الگ وجدانِ محبت
اس کی نظر رودادِ محبت
حرف و حکایت، شکر و شکایت
عشق کہے کیا، حسن کرے کیا
یوں بھی بدل جاتی ہے طبیعت
راہ طلب میں ایک سہارا
بندھتی ہمّت، چھوٹتی ہمّت
چھوڑ نہ مجھ کو چھوڑ نہ مجھ کو
یوں تو ہیں یکساں وصل اور فرقت

بے خبری کی دو تصویریں

تیرا تغافل میری محبت
جان کا دینا جان کا لینا
یہ بھی محبت، وہ بھی محبت

آنکھوں کے ہوتے دل کے ہوتے
عشق کی سمجھے قدر نہ قیمت
مٹ کے میں خوش تو بچکے بھی غمگیں
نیت نیت، قسمت قسمت

صبرِ دلِ ایوب ہوں اب میں
اے تری رحمت اے تری رحمت

اُس کی طرح مجھے بھول نہ جانا
اے غمِ فرقت، اے غمِ فرقت
ہجر کا رونا، وصل کا رونا
یوں بھی مصیبت، یوں بھی مصیبت
جَور کرم سا، لطف ستم سا
ایک معمّہ حُسن کی فطرت
غم پر فتح تو پائی۔ لیکن
پہچانی جاتی نہیں صورت
کون فراقؔ یہ باتیں سمجھے
تو نے بھی چھیڑی کیسی حکایت

۲۴

سنہ ۱۹۴۰ء

قسمت ہے تیرا یا تری رحمت

عشق، محبت، الفت، چاہت

چھوڑ یہ بحثِ مجاز و حقیقت

پہلے محبت سیکھ محبت

تیری صورت، میری طبیعت

یہ بھی کہانی وہ بھی حکایت

دُنیا کی بدلی جو حالت
حسن بھی بھولا ناز و نزاکت

اک مدت سے ہے اب تو یہ حالت
ہوش نہ غفلت رنج نہ راحت

سیدھی قسمت ٹیڑھی قسمت
سب کا علاج ہے دردِ محبت

ایک دیس کے نام ہیں دونوں
دوزخ کہئے اُسے یا جنت

حسن ہے بے بس دیکھ کے تجھ کو
اے دلِ مضطر غیرت غیرت

عشق عذاب ضرور ہے لیکن

اس سے بچنے کی کوئی صورت

حسن کا دل بھی بھر آتا ہے

پھر بھی ہوں شاداں اُف ری طبیعت

دیکھیں رہے یہ رنگ بھی کب تک

گھٹتی محبت، بڑھتی مُروّت

ایک ہی وقت میں خوش بھی غمیں بھی

یہ بھی ہے اک شانِ محبت

آج تمھیں دل کو سمجھا دو

میری تو پڑتی نہیں ہمت

ایک عشق اور اِتنے دشمن
ایک مصیبت لاکھ مصیبت

کیا کہنا تجھ کو گر ملتی
تیری صورت میری طبیعت

رہگذرِ عُشّاق رہی ہے
دوزخ دوزخ جنت جنت

حسن ہی ہے یا اور کچھ اے دل
جانِ عشق، ایماں محبت

سوچ رہا ہوں زمانہ گذرا
کھائے ہوئے فریبِ محبت

عشق ابھی سے تنہا تنہا

ہجر کی بھی آئی نہیں نوبت

کچھ تو نے بھی سُنا؟ کہتے ہیں

اور ہے اب تو فراق کی حالت

ہزار دیکھے حسیں اور یہ کوئی طور نہیں

تمہارے سامنے یہ میں ہوں کوئی اور نہیں

۲۵

سنہ ۱۹۳۸ء

ہنگامہ خیزِ دورِ محبت ہے دُور دُور
دنیا میں آج شورِ قیامت ہے دُور دُور

ہر منزل و مقام سے وحشت ہے دُور دُور
اب تو نگاہِ ناز کی شہرت ہے دُور دُور

خونِ جگر سے سوزِ غمِ عشق سے تری
شوخی ہے دُور دُور شرارت ہے دُور دُور

دنیائے اعتبار میں تو ہی نہیں ملا
یوں تو رسائیِ غمِ فرقت ہے دُور دُور

اے نرگسِ سیاہ تری وحشیں بجا
خود مجھ سے اب جنونِ محبت ہی دُور دُور

ہر منزل و مقام سے ہر سمت و نیت سے
یہ کیوں کشاکشِ غمِ الفت ہے دُور دُور

دل سے "تری قسم" تجھے ہم پائیں یا نہ پائیں
لالچ ہے دُور دُور قناعت ہے دُور دُور

کیا بات ہے کہ پرسشِ مبہم کے با وجود
دل سے تری نگاہِ مروت ہے دُور دُور

معصومیِ نگاہ کی کیفیتیں تو دیکھ
پہنچی ہوئی اس آنکھ کی نیت ہے دُور دُور

تاریکیاں مجاز کی اکثر چمک گئیں
جلوہ فروزِ شمعِ حقیقت ہے دُور دُور

مٹ کر بھی ہم سمجھ نہ سکے جس کی نیتیں
سنتے ہیں اس نظر کی شکایت ہی دُور دُور

دنیا میں آج کوئی کسی کا نہیں رہا
اے لطفِ یار تیری ضرورت ہے دُور دُور

پھرتی ہیں جو گھنی ہوئی پلکوں کے سائے سائے
اُن سُرمگیں نگاہوں کی شہرت ہی دُور دُور

سچ ہے کہ مجھ کو ہوش نہیں اضطراب میں
یہ کم ہے مجھ سے تیری عنایت ہی دُور دُور
دیکھیں فراق عشق کی یہ کس مپرسیاں
اب درد دُور دُور ہے راحت ہے دُور دُور

اے دوست محبت کی کچھ پوچھ نہ مجبوری
اک ہجر تری قربت اک ہجر تری دُوری

۳۶

سنہ ۱۹۳۷ء

ترا جمال بھی ہے آج اک جہانِ فراق
نگاہِ لطف و کرم خود ہے ترجمانِ فراق

فضا جہانِ محبت کی جن سے تھی رنگیں
تجھے بھی یاد کچھ آئے وہ شادمانِ فراق

نظر بچا کے جنھیں برقِ حسن چھوڑ گئی
ملے نہ زخمِ نہاں میں بھی وہ نشانِ فراق

نگاہِ ناز تری تھی تمام قول و قسم
کسی کو ہو بھی نہ سکتا تھا کچھ گمانِ فراق
رُلا گئی ترے آسودگانِ خاک کی یاد
وہ بے نیازِ محبت وہ راز دانِ فراق
اُٹھے ہیں تیغِ تغافل کے کھول کر جوہر
نہ کیوں ہوں زندۂ جاوید کشتگانِ فراق
بتا تو کیا نگہِ اوّلیں کے بعد ہوا
مجھے بھی یاد ہے کم کم وہ داستانِ فراق
امید بن کے نہ آئے دلوں کی دُنیا میں
اسے سمجھ نہیں سکتے یہ بدگمانِ فراق

وہ بے قراریِ دل وہ فضائے تنہائی
وہ سرزمینِ محبت وہ آسمانِ فراق

گدازِ دل سے حقیقت سرشکِ غم کی نہ پوچھ
ہر ایک قطرہ تھا اک بحرِ بیکرانِ فراق

جسے مٹا نہ سکی برقِ کم نگاہیِ حسن
وہی امید کی دنیا ہے پاسبانِ فراق

خود آشنا نہیں ان سے حریمِ تنہائی
یہ سوز و ساز ہیں ناخواندہ میہمانِ فراق

سکونِ قرب سے کچھ بے قرار تنگ آ کر
سنا ہے ڈھونڈھتے پھرتے ہیں اب امانِ فراق

خبر کچھ اُن کو نہیں اب ترے تغافل کی
بس آج چین سے سوئے بلا کشانِ فراق

جو ایک برقِ نگہہ سامنے سے کوند گئی
وہی تھی رُوحِ محبت وہی ہے جانِ فراق

بچھڑ کے تجھ سے کہیں دیکھنا نہ پڑ جاتے
وصال ایسوں کا جن کی جدائی شاق نہیں

۲۷

۱۹۳۶ء

ایک عالم پہ بار ہیں ہم لوگ
کس کے دل کا غبار ہیں ہم لوگ

صد تقاضائے فنا کی ہیں تصویر
عالمِ انتظار ہیں ہم لوگ

ہم سے شادابیاں حیات کی ہیں
چشمِ خونابہ بار ہیں ہم لوگ

ہم سے ہے گرم سینۂ ہستی
وہ بھڑکتے شرار ہیں ہم لوگ
ہم سے پھوٹی شعاعِ صبحِ حیات
مطلعِ روزگار ہیں ہم لوگ
ہم میں پنہاں رموزِ نشو و نمو
پردہ دارِ بہار ہیں ہم لوگ
ہم نے توڑی ہر ایک قیدِ حیات
کتنے بے اختیار ہیں ہم لوگ
ہم نے فردا کو کر دیا امروز
کیا قیامت شعار ہیں ہم لوگ

زندہ باد! انقلاب زندہ باد!

سر بکف ہیں نثار ہیں ہم لوگ

اثرِ دردِ زندگی سے فراق

بے خود و بے قرار ہیں ہم لوگ

یعنی صبحِ ازل سے اپنے لئے

ہمہ تن انتظار ہیں ہم لوگ

یونہی سا کچھ نیاز و ناز میل ملاپ کچھ یونہی

آ کے یہیں پہ قربِ دوست ہجرِ دوام بن گیا

۳۸

سنہ ۱۹۱۹ء

کیا کہیں آئے تھے کس اُمید سے کس دل سے ہم

اک جنازہ بن کے اُٹھتے ہیں تری محفل سے ہم

رفتہ رفتہ موت کی نیند آگئی ہنگام ذبح

سو گئے افسانۂ بیدردیٔ قاتل سے ہم

اب محبت بھی تری سعیِ تشفی بن گئی

ورنہ یوں مایوس ہوتے تھے ذرا مشکل سے ہم

اپنا پیمانِ وفا پھر یاد کر لے ایک بار

آج ہوتے ہیں جدا اے دوست تیرے دل سے ہم

رُوٹھ کر تجھ سے بہت بیدرد ہم بھی ہو گئے
ایک خنجر ہو گئے جب سے کھنچے قاتل سے ہم

جا رہے ہیں چوٹ سی دل پر لئے اے دوستو!
پہنچے تھے اس محفل میں بڑی مشکل سے ہم

جان لیوا اے جنوں گو ہیں یہ سرگردانیاں
کیوں بھٹک جاتے ہیں لیکن خود رہِ منزل سے ہم

رُکنے والو سختیِ منزل اسی کا نام ہے
چل نہیں پڑتے خیالِ سختیِ منزل سے ہم

نبھ نہیں سکتا کبھی الیسوں کا باہم ارتباط
فطرتاً تم رکھتے ہو نفرت حق سے تم باطل سے ہم

آج کوچے میں ترے تجھ کو خبر ہے یا نہیں
ہو گئے رو کر جدا اے دوست اپنے دل سے ہم

کٹ گئی اے بحرِ غم موجوں سے ہنستے کھیلتے
بہتے بہتے دیکھ آخر آ لگے ساحل سے ہم

حسن کے جور و تغافل کا بھی کس کو اعتبار
دل شکستہ ورنہ ہوتے تھے ذرا مشکل سے ہم

کیوں جھجک اٹھتے ہیں انجامِ محبت سے فراقؔ
باخبر ہیں اس کے ہر آسان ہر مشکل سے ہم

۳۹

سنہ ۱۹۳۶ء

کسی سے دُور رہ کر شادماں رہنے پہ مائل ہیں
مگر نیرنگیِ دردِ نہاں کے ہم بھی قائل ہیں

عجب کیا کھوئے کھوئے سے جو رہتے ہیں ترے آگے
ہمارے درمیاں اے دوست لاکھوں خواب حائل ہیں

نگاہِ ناز سَو سَو طرح سے ہے مہرباں لیکن
وہ تاثیرِ محبت کے نہ قائل تھے نہ قائل ہیں

وہ میرا درد ہے وحشت ہی جس سے اک زمانے کو
وہ تیرا حُسن ہے اہلِ دوعالم جس پہ مائل ہیں

یہ تیری چارہ سازی سر بسر اعجاز ہے لیکن
وہ دردِ لا دوا ہے جس کے اہلِ شوق گھائل ہیں

وہی آثارِ الفت تفرقہ پہ دانہ بھی نکلے
جنھیں سمجھا کئے ملنے کے تیرے یہ وسائل ہیں

وہ لاثانی ہیں اُن کا اے دلِ خوں گشتہ کیا کہنا
نہایت خوبصورت ہیں نہایت خوش خصائل ہیں

یہ اُن کی بے رُخی برحق، بجا کبر و غرور اُن کا
سراپا ناز ہیں گُل رنگ ہیں زہرہ شمائل ہیں

نہیں معلوم جو ہم بے خود دل کو اے جہاں والو
وہ کیا عقلی دلائل ہیں وہ کیا علمی مسائل ہیں

دو عالم ہو چکے ہیں اُن پہ ملے شیخ جسم صحے قے

تجھے معلوم بھی ہے اہلِ دل کس در کے سائل ہیں

یہ اہلِ جور کے شکوے بجا یہ شکر بھی برحق

نہ قائل ہوں گے وہ ہرگز نہ قائل تھے نہ قائل ہیں

بہت کچھ سہہ ہے ابھی اے مہرباں جیبِ محبت میں

یہ مانا رنگِ رُخ، ہوش و حواس و صبر زائل ہیں

فرازِ طورِ سینا، بتکدے کعبے کے دروازے

ابھی راہِ محبت میں در و دیوار حائل ہیں

فراقؔ اُس سے بچھڑی ہے بحثِ الفت دیکھیے کیا ہو

معاون ساری باتیں ہیں موافق سب دلائل ہیں

۳۰

سنہ ۱۹۲۰ء

میں نے دیکھی ہیں یہ آنکھیں مستِ افسوں گر کہاں
ساقیا چھوٹا تھا میرے ہاتھ سے ساغر کہاں

یوں اُترتی جانے والی اے نگاہِ شرگیں
ڈوب کر دیکھیں نکلتا ہے ترا نشتر کہاں

رہروانِ کوئے جاناں آہ اتنی ٹھوکریں
ہم نے بھی بے دست و پا ہو کے کیا بستر کہاں

اے جنوں اب حالِ گلزارِ خزاں دیدہ نہ پوچھ

وہ نسیمِ صبح کے جھونکے چمن پرور کہاں

یاد ہیں لبہائے جاناں کی تبسم ریزیاں

بات وہ تجھ میں بھلا موجِ مئے کوثر کہاں

خون تھا کلیوں کا دل بادِ صبا بیچین تھی

جلوۂ گلزار ڈوبے تھے ترے نشتر کہاں

جامِ دل کی تہ میں موجِ خوں سے اٹھ کر رہ گئی

اپنی قسمت میں کوئی چھلکا ہوا ساغر کہاں

آنکھیں بھر آتی ہیں اکثر پچھلی شب کو اے فراق

وہ خمارِ چشمِ ساقی وہ بھرے ساغر کہاں

۱۳۱

۱۹۳۸ء

حجاب بے خبری کے اُٹھائے جاتے ہیں
تم آؤ ہوش میں دیوانے آئے جاتے ہیں
حریفِ انجمنِ دہر ہے ابھی شبِ گور
چراغِ بزمِ عدم جھلملائے جاتے ہیں
نثار نشۂ ہستی یہ بزمِ غم ہے یہاں
بہت سنبھال کے ساغر اُٹھائے جاتے ہیں

نگاہِ مست کے دستِ کرم سے پیہم بے
فنا بقا کے خزانے لٹائے جاتے ہیں

وہ مستیاں ہوں کہ ہشیاریاں ہوں عشق میں بھی
تری نگاہ کے انداز پائے جاتے ہیں

ابھی تو دامنِ گلزارِ رنگ پر بھی نہیں
ابھی سے دستِ جنوں تھرتھرائے جاتے ہیں

نظر کی چوٹ نہیں اوپری رگوں کے لئے
بچا بچا کے یہاں دل دکھائے جاتے ہیں

عدم کو درد ترا لے کے جیتے جی پہنچے
کہیں اجل سے یہ صدمے اٹھائے جاتے ہیں

وہ صاف عشق سے بے لاگ ہو کے آنکھوں سے
کوئی قسم سہی، مگر اب بھی کھائے جاتے ہیں

ہوس ہے عشق ہے ادراک ہے منزلِ بے نام
یہیں پہ کھوٹے کھرے آزمائے جاتے ہیں

اب ہو آ چلا ہے مجھے اک سکونِ نامحسوس
عجب دردِ محبت اُٹھائے جاتے ہیں

نصیبِ عشق جہاں سو رہے ہیں موت کی نیند
وہیں اس آنکھ کے جادو جگائے جاتے ہیں

وہ قرب و بعد کی حد سے الگ تو ہیں لیکن
تمام عالمِ ہستی پہ چھائے جاتے ہیں

حریفِ زخمِ نہاں نشترِ نظر بھی نہیں
بہت بچا کے یہ چرکے لگائے جاتے ہیں

اُدھر ہے مقتلِ دنیا اِدھر ہے مقتلِ عشق
جو بچ رہے تھے یہاں کام آئے جاتے ہیں

غمِ نہاں کے اشارے سے دل تیرے دیوانے
زمین پر نئی دُنیا بسائے جاتے ہیں

مریضِ عشق کی بالیں پر اور عالم ہے
اب اِس مقام سے اپنے پرائے جاتے ہیں

کمالِ جذب و کشش دیکھ عاشقوں کو بھی
خبر نہیں وہ دلوں میں سمائے جاتے ہیں

نگاہِ ناز میں آتا چلا حجاب سا کچھ
یہیں سے شوق کے پہلو دبائے جاتے ہیں
کبھی کے رہا بھی چکے سر لسیر بھُلا بھی چکے
ہم اُن سے آج بھی دامن چھڑائے جاتے ہیں
انھیں بہار کی آنکھوں نے بھی نہیں دیکھا
جو گُل چمن کو مٹا کر کھلائے جاتے ہیں
نہ راہ و رسم نہ اب کوئی عہد و پیماں ہے
وہ بے خودِ دل کو مگر یاد آئے جاتے ہیں
چمک گئی دلِ ہستی میں آج بجلی سی،
جہاں میں نقشِ وفا یوں اُٹھائے جاتے ہیں

بہ ہر نظر نگہِ اولیں کی کیفیت
ارے یہ کب کے فسانے سنائے جاتے ہیں
غبارِ راہِ طلب اُٹھ کے بیٹھ بھی نہ سکا
فراقؔ ابھی سے قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

تو یاد بھی کرے مجھے دل سے میرا نہ ہوا میرا نہ ہوا
میں تجھ کو بھلا کر بھی لیکن تیرا ہی رہا تیرا ہی رہا

۳۲

سنہ ۱۹۳۸ء

کیوں بے قرار میری طبیعت ہے اِن دنوں
بھولی ہوئی اگرچہ وہ صورت ہے اِن دنوں

کیوں مجھ کو اک جہان سے وحشت ہے اِن دنوں
سنتا ہوں مجھ کو تجھ سے محبت ہے اِن دنوں

تجھ سے حیاتِ عشق نے اُف کیا اثر لیا
ہستی تمام شکر و شکایت ہے اِن دنوں

وہ سامنے ہے آج خوشا بیخودیِ دید
میں کہہ رہا تھا کیوں مجھے فرصت ہے اِن دنوں

وہ آگ لگ گئی کہ دھواں ہے نہ آنچ ہے
در پردہ اس نظر کی شرارت ہے اِن دنوں

کیوں داستانِ عمرِ گذشتہ نہ چھیڑئیے
اے دوست زندگی تو مصیبت ہے اِن دنوں

وہ مائلِ کرم سے میں امید وار سا
یعنی نظر ملانے کی فرصت ہے اِن دنوں

حیرت نہ کر ملول نہ ہو بدگماں نہ ہو
کچھ غیر اہلِ درد کی حالت ہے اِن دنوں

ہیں اس قدر اُداس تو اس درجہ مہرباں

اے دوست شکرِ خوبیِ قسمت ہے ان دنوں

بھولے ہوئے سے ہیں تجھے، کچھ دردِ دل کو بھی

یک گونہ اہلِ عشق کو راحت ہے ان دنوں

بیگانہ وار پڑتی ہے ہر ایک پر نگاہ

بدلی ہوئی اُس آنکھ کی نیت ہے ان دنوں

سامانِ انقلابِ محبت ہے آج کل

کاوش میں وہ نگاہِ مروت ہے ان دنوں

لطف و ستم، فنا و بقا سے ہوں بے نیاز

کس چیز کی نہ پوچھئے حسرت ہے ان دنوں

گم گشتگیٔ عشق تو خیر اور چیز ہے
کچھ کھوئے رہنے کی مجھے عادت ہے اِن دنوں

وہ پوچھتے ہیں وجہ سکوت و فسردگی
میں سوچتا ہوں کیا مری حالت ہے اِن دنوں

یوں تھرتھرا رہی ہیں رگیں کائنات کی
گویا قریب روزِ قیامت ہے اِن دنوں

فرق آ گیا ہے دورِ حیات و ممات میں
کیا گردشِ نگاہِ محبت ہے اِن دنوں

جیسے پلٹنے کی بھی ادا ہو گریز میں
یہ قرب، یہ فراق، مصیبت ہے اِن دنوں

دیکھی نہ تھی جنھوں نے کبھی صورت اُمید

اُن کو بھی تجھ سے چشم مروت ہے ان دنوں

اب کفر کے وہ رنگ نہ ایمان کے وہ طور

وہ عالم مجاز و حقیقت ہے اِن دنوں

ہم بھی حریفِ زاہدِ شب زندہ دار ہیں

اُس نرگسِ سیہ سے ارادت ہے اِن دنوں

ہر جلوہ اک جہانِ معانی ہے آج کل

اللہ کیا سے کیا تری صورت ہے اِن دنوں

کیوں ملتیں نہ کفر کی سرسبز ہوں پھر آج

ذوقِ گناہ پیرِ طریقت ہے اِن دنوں

گو بے نیاز ہیں وہ ہر اک حال سے مگر

اربابِ غم کو تیری ضرورت ہے اِن دِنوں

واقف نہ تھے کبھی مژۂ خوں چکاں سے جو

اُن کا بھی اور رنگِ طبیعت ہے اِن دنوں

اس باب میں فراقؔ کئی ہیں روایتیں

خود مجھ کو اپنے حال سے غفلت ہے اِن دنوں

بیٹھے بٹھائے چپ نہیں لگتی تھی یوں تجھے

کیوں کیوں فراقؔ کیا تری حالت ہے اِن دنوں

۳۳

۱۹۳۷ء

غبارِ دل پریشاں دُور کینے ہوتے رہتے ہیں
مصفّا کیمیائے غم سے سینے ہوتے رہتے ہیں

سلامت سوزِ پنہاں کیوں دلوں کی فکر ہو تجھ کو
گداز اکثر یونہی یہ آبگینے ہوتے رہتے ہیں

دلوں کو رازِ ساحل بحرِ غم کا مل ہی جاتا ہے
سراسر غرق اکثر یہ سفینے ہوتے رہتے ہیں

کریں کس طرح ظاہر عشق کی گستاخیاں اُس پر
ادب کو سامنے جس کے پسینے ہوتے رہتے ہیں

جو سچ پوچھو تو آنا ہے نہ جانا ہے نہ ملنا ہے
یونہی مدت سے دن ہفتے مہینے ہوتے رہتے ہیں

زبانِ حال سے پیدا نئے اظہارِ مطلب کے
سلیقے ہوتے رہتے ہیں قرینے ہوتے رہتے ہیں

ہیں روشن تھرتھراتے اشک سے حلقے محبت کے
کہ نورِ چشمِ خاتم یہ نگینے ہوتے رہتے ہیں

ازل سے کھلتے جاتے ہیں نہاں خانے حقیقت کے
ابد تک عشق کو حاصل دفینے ہوتے رہتے ہیں

فراقؔ اُس تک پہنچنے کے مدارج سے میں واقف ہوں
مگر زیر و زبر پیہم یہ زینے ہوتے رہتے ہیں

۴۳[1]

۱۹۳۷ء

ادائے دلبری سے بھی بہانے ہوتے رہتے ہیں
نگاہِ شرمگیں سے بھی اشارے ہوتے رہتے ہیں

یہ برقِ طور کیا، ظلمات کیا، مہر قیامت کیا
یہاں دن رات ساقی یہ تماشے ہوتے رہتے ہیں

کرے گا ان کو رسوا، پردہ کرنا بھی حسینوں کا
نمایاں سو طرح یہ ماہ پارے ہوتے رہتے ہیں

[1] اس غزل میں جس طرح قافیے لائے گئے ہیں میں اسے مستحسن نہیں سمجھتا
فراقؔ

ازل سے تیری بزمِ ناز محوِ خوش کلامی ہے
سکوتِ چشم سے بھی کچھ فسانے ہوتے رہتے ہیں

ترے اہلِ جنوں کی وحشتوں کا یوں تو کیا کہنا
بپا بے ہوش بھی اُن کے ٹھکانے ہوتے رہتے ہیں

نگاہِ یار کا ہر وعدہ پورا ہو گیا، لیکن
دلِ بیتاب کے ابتک تقاضے ہوتے رہتے ہیں

بہارِ گلستاں کیا غفلتِ رنگیں عنادل کی
کہ نذرِ آتشِ گل آشیانے ہوتے رہتے ہیں

نہ فکرِ بادہ پیمائی نہ ذوقِ زندی و مستی
یہ کیا کم ہے کہ ساقی سے اشارے ہوتے رہتے ہیں

تجاہل ہے تغافل ہے کشاکش ہے تکلف ہے
ادائے نو بہ نو سے وہ ہمارے ہوتے رہتے ہیں

زمانہ کروٹیں لیتا ہے اُس کے ہر اشارے پر
کہ وعدے ہوتے رہتے ہیں بہانے ہوتے رہتے ہیں

ازل سے انقلاب سرلبیر ہے عشق کی ہستی
فراقؔ اُن کے اشارے سے اشارے ہوتے رہتے ہیں

خوش فہمیاں تمام غلط فہمیاں تمام
اِس عشق میں ہو گیا کوئی بدنام و نیک نام

۳۵

سنہ ۱۹۲۴ء

پڑتے ہی آنکھ تجھ پر جو یوں تڑپ اُٹھا ہوں
دیکھا ہو جیسے پہلے پہچان سا گیا ہوں
دنیا کو میں بچا کر دُنیا کو دیکھتا ہوں
بیگانہ وش جو اُٹھے وہ چشمِ آشنا ہوں
اک وسعتِ نہاں ہوں اک موجِ بیکراں ہوں
کس دشت کی فضا ہوں کس باغ کی ہوا ہوں

کچھ کام عاشقی کے بگڑوں نے بھی سنوارے
میں قیس و کوہکن کی تقدیر سوچتا ہوں

بس یہ دُعا ہے مالک آباد اس کو رکھنا!
جس بزم مے کشی سے آنکھیں بھرے اُٹھا ہوں

آگے ترے کسی سے کیا کیا شکایتیں تھیں
منہ دیکھ کر کسی کا اللہ رہ گیا ہوں

اے جلوہ گاہِ جاناں اے منزلِ غریباں
کس رہ گذار میں ہوں میں کس دیار کا ہوں

کیفیتِ فنا ہوں دنیائے رنگ و بُو میں
میخانۂ عدم میں جام جہاں نما ہوں

اے سوز و سازِ الفت اے تلخیٔ محبت
اکسیر بن گیا ہوں یا زھر ہو گیا ہوں

محشر میں ساتھ میرا اب چھوڑتے نہیں ہیں
اللہ یہ وہی ہیں جن کو ترس گیا ہوں

کیا رات تھی الٰہی آنکھوں میں کٹ گئی جو،
پچھلے پہر کی دنیا حسرت سے دیکھتا ہوں

ہاں اے فراقؔ یونہی کچھ جی میں آ گئی تھی
یہ رازِ دل تھے جن کو باتوں میں کہہ گیا ہوں

۳۶[1]

سنہ ۱۹۲۴ء

تم ہو جہاں کے شاید میں بھی وہیں رہا ہوں
کچھ تم بھی بھولتے ہو کچھ میں بھی بھولتا ہوں

مٹتا بھی جا رہا ہوں پورا بھی ہو رہا ہوں
میں کس کی آرزو ہوں میں کس کا مدعا ہوں

سب سے بڑا گنہ ہے معصومیِ محبت
اب بخش یا سزا دے مجرم ہوں بے خطا ہوں

[1] اس غزل کے کچھ اشعار سنہ ۱۹۴۷ء میں کہے گئے۔ فراقؔ

کیفِ فنا بھی مجھ میں، شانِ بقا بھی مجھ میں
میں کس کی ابتدا ہوں، میں کس کی انتہا ہوں

منزل کی یوں تو مجھ کو کوئی خبر نہیں ہے
دل میں کسی طرف کو کچھ سوچتا چلا ہوں

میں ہوں بھی یا نہیں ہوں یہ بھی خبر نہیں ہے
میں کیا کہوں کہاں ہوں میں کیا بتاؤں کیا ہوں

دردِ فراقِ جاناں، سوز و گدازِ پنہاں
آرام دے رہے ہیں آرام پا رہا ہوں

لیتی ہیں اُلٹی سانسیں جب شامِ غم فضائیں
اُس دم فنا بقا کی میں نبض دیکھتا ہوں

ہوں وہ شعاعِ فردا جو آنکھ مل رہی ہے
وہ سرمگیں افق پر میں تھرتھرا رہا ہوں
ہوں موجِ آبِ حیواں اُٹھتا ہوں خون ہو کر
میں دردِ زندگی ہوں اور دردِ لا دوا ہوں
جس سے شجر حجر میں اک روح دوڑ جائے
وہ سازِ سرمدی میں غزلوں میں چھیڑتا ہوں
میں اے فراقؔ حسنِ دوشیزۂ ازل کی
معصومیِ نظر ہوں، میں عشق کی خطا ہوں

۳۷

سنہ ۱۹۳۱ء

لاکھ محروم سے مایوس سے بیزار سے ہیں
لیکن امیدیں بھی تیرے کیے انکار سے ہیں

دیکھنے والے ترے آج بھی بیدار سے ہیں
آج بھی آنکھ لگائے رسن و دار سے ہیں

بجلیاں ٹوٹ رہی ہیں نگہِ ساقی سے
چشمکیں موجِ مئے ساغرِ سرشار سے ہیں

مدتیں قید میں گذریں مگر اب تک صیاد
ہم اسیرانِ قفس تازہ گرفتار سے ہیں
کیا کہیں وہ ترے اقرار کہ اقرار سے تھے
کیا کریں یہ ترے انکار کہ انکار سے ہیں
یوں تو غربت میں بھی سر پیٹتے ہیں تیرے اسیر
یوں تو کہنے کو یہاں بھی در و دیوار سے ہیں
کچھ نہ جینے ہی میں رکھا ہے نہ مر جانے میں
کام جتنے بھی محبت کے ہیں بیکار سے ہیں
تو تو نادم نہ کر اے یار کہ تجھ پر مٹ کے
خود ہم اپنی ہی نگاہوں میں گنہگار سے ہیں

شاد و آباد ہیں اے دوست محبت میں ہمیں
ہمیں بیکس سے ہیں بیدل سے ہیں بیزار سے ہیں

صلح کل جس کی چڑھی تیوریوں پر صدقے ہو
معرکے آج اُسی آمادۂ پیکار سے ہیں

اُف اشاراتِ نہاں سے وہ بڑھانا دل کا
کیا کریں دیدۂ مخمور خبر دار سے ہیں

آہ! یہ اتنے دنوں بعد تری پرسشِ غم
شکوے اک عمر کے اپنے دلِ بیزار سے ہیں

کہہ دیا تو نے جو معصوم تو معصوم ہیں ہم
کہہ دیا تو نے گنہگار، گنہگار سے ہیں

ہم نظر باز وہاں کے ہیں کہ آئینہ کو بھی
تیرے دیدار جہاں حسرتِ دیدار سے ہیں

سر فروشانِ محبت پہ ہیں احساں تیرے
تیرے ہاتھوں یہ سبکدوش گرانبار سے ہیں

خیر خوش ہو لے اشاراتِ نہاں سے کوئی روز
آشنا ہم بھی کچھ اے دل نگہہ یار سے ہیں

لب جاں بخش کے اعجاز سے انکار نہیں
کچھ اشارے بھی مگر نرگسِ بیمار سے ہیں

شکوۂ جور و تقاضائے کرم سب بے سود
کیوں مگر پردۂ انکار میں اقرار سے ہیں

وہی ہم ہیں وہی تم ہو وہی دل ہے لیکن

کچھ نہ کچھ سب کے بدلتے ہوئے آثار سے ہیں

جس کو دُکھنے کی طرح آئے نہ دُکھنا بھی فراقؔ

تنگ آئے ہوئے ہم تو دلِ بیمار سے ہیں

ترا وصال بڑی چیز ہے مگر اے دوست

وصال کو مری دنیائے آرزو نہ بنا

۳۸

۱۹۳۴ء

بستیاں ڈھونڈ رہی ہیں انھیں ویرانوں میں
وحشتیں بڑھ گئیں حد سے ترے دیوانوں میں

نگہ ناز نہ دیوانوں نہ فرزانوں میں
جان کار ایک وہی ہے مگر انجانوں میں

بزم مے بے خود و بیتاب نہ کیوں ہو ساقی
موج بادہ ہے کہ درد اُٹھتا ہے پیمانوں میں

میں تو میں چونک اُٹھی ہے یہ فضائے خاموش
یہ صدا کب کی سُنی آتی ہے پھر کانوں میں

وسعتیں بھی ہیں نہاں تنگئ دل میں غافل
جی بہل جاتے ہیں اکثر انھیں میدانوں میں

جان و ایمانِ جنوں سلسلہ جنبانِ جنوں
کچھ کششہائے نہاں جذب ہیں ویرانوں میں

خندۂ صبحِ ازل تیرگیِ شامِ ابد
دونوں عالم ہیں چھلکتے ہوئے پیمانوں میں

دیکھ جب عالمِ ہُو کو تو نیا عالم ہے
بستیاں بھی نظر آنے لگیں ویرانوں میں

جس جگہہ بیٹھ گئے آگ لگا کر اُٹھے"

گرمیاں ہیں کچھ ابھی سوختہ سامانوں میں
وحشتیں بھی نظر آتی ہیں سرِ پردۂ ناز
دامنوں میں ہے یہ عالم نہ گریبانوں میں
ایک رنگینیِ ظاہر ہے گلستاں میں اگر
ایک شادابیِ پنہاں ہے بیابانوں میں
یہ جو ہر غنچہ و گل میں ہے اک اندازِ جنوں
کچھ بیاباں نظر آئے ہیں گریبانوں میں
اب وہ رنگِ چمن و خندۂ گل بھی نہ رہے
اب وہ آثارِ جنوں بھی نہیں دیوانوں میں

اب وہ ساقی کی بھی آنکھیں نہ رہیں رندوں سے
اب وہ ساغر بھی چھلکتے نہیں میخانوں میں

اب وہ اک سوزِ نہانی بھی دلوں میں نہ رہا
اب وہ جلوے بھی نہیں عشق کے کاشانوں میں

اب نہ وہ رات جب امیدیں بھی کچھ تھیں تجھ سے
اب نہ وہ بات غمِ ہجر کے افسانوں میں

اب ترا کام ہے بس اہلِ وفا کا پانا
اب ترا نام ہے بس عشق کے غمخانوں میں

تا بکے وعدۂ موہوم کی تفصیل فراق
شب فرقت کہیں کٹتی ہے ان افسانوں میں

۳۹

سنہ ۱۹۲۷ء

عشق کی مایوسیوں میں سوزِ پنہاں کچھ نہیں
اس ہوا میں یہ چراغِ زیرِ داماں کچھ نہیں

کیا ہے دیکھو حسرتِ سیرِ گلستاں کچھ نہیں
کچھ نہیں اے ساکنانِ کنجِ زنداں کچھ نہیں

عشق کی ہے خود نمائی عشق کی آشفتگی
روئے تاباں کچھ نہیں زلفِ پریشاں کچھ نہیں

یاد آ ہی جاتی ہے اکثر دلِ برباد کی

یوں تو سچ ہے چند ذراتِ پریشاں کچھ نہیں

سچ ہے جو کچھ بھی ہے وہ ہے گرمیِ بازارِ حسن

اہلِ دل کا سوزِ پنہاں کچھ نہیں ہاں کچھ نہیں

اور اُن کی زندگی ہے اور عنوانِ حیات

خود فراموشوں کو تیرے عہد و پیماں کچھ نہیں

ایک ہو جائے نہ جب تک سرحدِ ہوش و جنوں

ایک ہو کر چاکِ داماں و گریباں کچھ نہیں

جو نہ ہو جائے وہ کم ہے جو بھی ہو جائے بہت

کارزارِ عشق میں دشوار و آساں کچھ نہیں

دیکھنی تھی دیکھ لی اس چھیڑ کی بھی سادگی
بے دلوں میں یہ تبسم ہائے پنہاں کچھ نہیں

کاش اپنے درد سے بیتاب ہوتے اے فراقؔ
دوسرے کے ہاتھوں یہ حالِ پریشاں کچھ نہیں

دنیا سے ہوئی پیش سرِ منزلِ جاں
ورنہ خیالِ فلک صبح و درخشاں

۴۰

سنہ ۱۹۲۵ء

انا لیلیٰ کے نعرے گونجتے ہیں کُنجِ محمل میں
بھلا کیا گھر کرے کوئی دلِ دیوانۂ دل میں

خودی نے میری ہستی کو بنایا وادیِ غربت
الجھیں وہموں کے ہاتھوں دُور رہا منزل سے منزل میں

سبک رفتار ہے یوں تو نسیمِ صبح گاہی بھی
مگر ہے اور بات اے دل خرامِ نازِ قاتل میں

لرزتی ہے نسیم صبح خوفِ خونِ ناحق سے
رنگی ہے ہر گلِ تر کی قبا خونِ عنادل میں

کشودِ دل سے سینہ غیرتِ گلزارِ جنت ہے
یہ کس گل کی الٰہی نکہتِ برباد تھی دل میں

یہ کیا ڈوبیں گے بحرِ عشق کی یہ تھاہ کیا لیں گے
کسی کے پاس دل بھی ہے سبکسارانِ ساحل میں

اشارے پر جنوں کے چل رہے ہیں تیرے زندانی
عجب بے ساختہ پن آج ہے شورِ سلاسل میں

بیانِ خونِ دل ہے ایک عالم پر ہے سناٹا
سناتا ہوں یہ افسانہ زبانِ تیغِ قاتل میں

ہم اہلِ انجمن سے پوچھ اُسے جو ربطِ پنہاں ہے
ہمارے قلبِ سوزاں میں گدازِ شمعِ محفل میں

کوئی دل چھوڑ کر جاتا ہے کر لو صبر جانے دو
تمھیں آکر فراقؔ اب بس رہو اس اُجڑی محفل میں

اور ہے رنگِ سکوت آج دمِ عرضِ وفا
کہیں پھٹکار نہ دے کچھ بھی نہ سننے والا

۱۴

۱۹۳۶ء

جنونِ کارگر ہے اور میں ہوں
حیاتِ بے خبر ہے اور میں ہوں

کہاں میں آ گیا اے زورِ پرواز
وبالِ بال و پر ہے اور میں ہوں

نگاہِ اولیں سے ہو کے برباد
تقاضائے دگر ہے اور میں ہوں

مبارک یادِ ایامِ اسیری
غمِ دیوار و در ہے اور میں ہوں

بہارِ حسن کی نیرنگیاں ہیں
غمِ وحشت اثر ہے اور میں ہوں
سکوتِ ناز سے ہر اک گلہ کا
جوابِ مختصر ہے اور میں ہوں
تری جھجکتیں یاں اور تو ہے
طوافِ دربدر ہے اور میں ہوں
کوئی ہو شستہ پیماں بھی تو یوں ہو
یہ شامِ بے سحر ہے اور میں ہوں
نگاہِ جانستاں ہے اور رگِ جاں
کمالِ چارہ گر ہے اور میں ہوں

تغافل حسن کا ہے اور تو ہے

نصیب بہرہ ور ہے اور میں ہوں

مٹے ہنگامۂ عشقِ فغاں سنج

غمِ بے شور و شر ہے اور میں ہوں

نگاہ بے محابا تیرے صدقے

کئی ٹکڑے جگر ہے اور میں ہوں

ٹھکانا ہے کچھ اِس عذرِ ستم کا

تری نیچی نظر ہے اور میں ہوں

فراق ایک ایک حسرت مٹ رہی ہے

یہ ماتم رات بھر ہے اور میں ہوں

۴۲

سنہ ۱۹۲۷ء

عشق کو مِٹ کے بھی قرار نہیں
نیستی کا بھی اعتبار نہیں
آکے جائے یہ وہ بہار نہیں
نشۂ عشق میں خمار نہیں
میں بھی کوئی ادا ہوں کیا تیری
مجھ کو اک حال پہ قرار نہیں

میں گریباں پکڑ کے یوں روؤں
اے جنوں تیرا اعتبار نہیں

دل کو صدمے ہوا ہی کرتے ہیں
ہاں نگہ تیری شرمسار نہیں

کھینچ دیتا جنوں کی پاک تصویر
ہاتھ میں دامنِ بہار نہیں

یوں تو میں بھی نہیں کوئی غم دوست
یوں تو تم بھی ستم شعار نہیں

کوئی ان کا مزاج پا نہ سکا
اُن نگاہوں کا اعتبار نہیں

دے پیام حیات اور کہ عشق
قائل جبر و اختیار نہیں

بیخودی سی ہے بیخودی اے عشق
مجھ کو اپنا بھی انتظار نہیں

تیرے آنے کی کیا امید مگر
کیسے کہہ دوں کہ انتظار نہیں

ایک بھی تو نہیں ہے مست دخراب
کوئی دنیا میں ہوشیار نہیں

ٹھہری ٹھہری سی جیسے برق خیال
نگہہ یار سے قرار نہیں!

حسن کو میں نے کب دیا الزام
عشق بھی تو قصوروار نہیں
ہجر اور وصل ایک سے ہیں فراق
حسن کا بھی کچھ اعتبار نہیں

میں زندگی سے آشنا تھا کب اتنا اداس
سچ ان آنکھوں سے میں جھوٹا پڑا

۳۴[له]

سنہ ۱۹۱۹ء

سہانی رات ہے چھٹکے ہوئے ستارے ہیں
سکوتِ نیم شبی کے لطیف اشارے ہیں

جنوں میں یہ دلِ بیتاب کے اشارے ہیں
کہ مہر و ماہ اسی برق کے شرارے ہیں

جو چھپ کے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتے ہیں
انھیں سے سنتے ہیں افلاک چال ہارے ہیں

[له] یہ غزل سنہ ۱۹۴۷ء میں مکمل ہوئی۔ فراق

قفس نصیبوں سے آنکھیں چُرا نہ بادِ صبا
چمن سے دُور ہیں جیتے ترے سہارے ہیں

نہ بے خبر تھے نہ ہشیار تاب تھی نہ قرار
نہ پوچھ عشق کے دن کس طرح گزارے ہیں

یہ کیا ہم اہلِ زمیں کی بنائیں گے تقدیر
کہ خود نجومِ فلک قسمتوں کے مارے ہیں

تمام قامتِ رنگیں ہے خوابِ کاہکشاں
یہ پیکرِ عرق آلود کے ستارے ہیں

یہی ادائے حیا جان ہے محبت کی
جو نیچی نظروں سے کہتی ہے ہم تمھارے ہیں

فراقؔ اُن پہ بھی کیا کیا گماں گزرتا ہے
مری نظر میں جو حُور و پری سے پیارے ہیں

بھیدِ دل کیا ہے کھلا آج ترے لڑنے پر
تجھ سے اتنی تھی محبت مجھے معلوم نہ تھا

یہ بے نیازیاں ہیں تھوڑے دنوں سے ورنہ
ہانکا ہے دیکھ بھی تجھ سے چاہا ہے سیکھ بھی تب بھی

۴۴

سنہ ۱۹۲۷ء

نہ جانے کیا ہے ساقی مے پرستوں کے مقدر میں
سراسر گردشِ افلاک کا عالم ہے ساغر میں
محبت نے فسانہ کر کے چھوڑا رہتی دنیا کو
بھرے کیفِ عدم عالم کے رنگا رنگ منظر میں
وہ گم گشتہ تو کیا آیا صدا لئے بازگشت آئی
پکار آئے دلِ برباد کو ہم کوئے دلبر میں

نہ کھولی آنکھ تم نے بادۂ ہستی کے متوالو
تمھی اک جاتی ہوئی دنیا یہاں ایک ایک منظر میں

نہ ہو احساس تو سارا جہاں ہے جسمِ مُردہ
گداز دل ہو تو دُکھتی رگیں ملتی ہیں پتھر میں

نشیمن جل رہے ہیں، ہر چمن شعلہ بداماں ہے
یہ کس نے بجلیاں رکھ دی تھیں ہر برگِ گلِ تر میں

پیامِ مرگِ بے ہنگام ہے یا دل ہے پہلو میں
میں کس کے ساتھ جاتا ہوں حریمِ نازِ دلبر میں

کچھ اس سے رہروانِ عشق کو دلبستگی سی ہے
وہ زعمِ رہنمائی دیکھتے جاتے ہیں رہبر میں

تجھے دیکھیں مرا چاکِ گریباں دیکھنے والے

یہی اک رازِ پنہاں تھا طلوعِ صبحِ محشر میں

دلِ غمگیں ذرا آواز دینا عمرِ رفتہ کو

یہ حسرت آج کیسی ہے نگاہِ نازِ دلبر میں

یہ سازِ دل، گدازِ دل، یہ گرمی، یہ گرانباری

ہوا میں ہے نہ پانی میں نہ آتش میں نہ پتھر میں

ہمیں ہیں زندہ در گور اور ہمیں ہیں زندۂ جاوید

نہ بختِ خضر میں یہ ہے، نہ تقدیرِ سکندر میں

یونہی کچھ بیقراری میکشوں کی کم نہ تھی ساقی

چھڑی سی آج کیوں کھنچ کھنچ کے رہ جاتی ہے ساغر میں

چھڑا اس رنگ سے افسانۂ بیدردیِ قاتل
شہیدِ ناز کو نیند آ گئی آغوشِ خنجر میں

صدائے آمد آمد دل سے اُٹھی خیر ہو یارب
فنا کے راز پنہاں ہیں خرامِ نازِ دلبر میں

گدازِ انجمن میں اک درماندگی کا کیف عالم میں
فراقؔ ایسی کہاں ہے شامِ غم سب کے مقدر میں

آج رگ رگ میں جان دوڑ گئی
موت نے زندگی کو چھیڑ دیا

۴۵

سنہ ۱۹۳۳ء

تم نے وحشی بھری دنیا کو ویرانا سمجھتے ہیں
مگر ایک ایک ذرّہ کو بھی اک دنیا سمجھتے ہیں

نہ ہم ایسا سمجھتے تھے، نہ ہم ایسا سمجھتے ہیں
مگر کیا جانئے سب لوگ تجھ کو کیا سمجھتے ہیں

طلسمِ رنگ و بو کو اہلِ دل کیا کیا سمجھتے ہیں
کبھی دھوکا کبھی پردا کبھی جلوا سمجھتے ہیں

چھڑا رکھا ہے تجھ سے وسوسوں نے وصل و فرقت کے

انھیں وہموں سے اپنے آپ کو تنہا سمجھتے ہیں

چھپا بھی کچھ نہیں رہتا نظر بھی کچھ نہیں آتا

اسی کو ہم ترا دیدار ہو جانا سمجھتے ہیں

اب اتنی بھی نہیں بہکی مری بہکی ہوئی باتیں

جنھیں بے وقت، بے تک، بے محل، بیجا سمجھتے ہیں

مثال بے مثالی ہے زمانے سے نرالی ہے

کسی کی سادگی کو لوگ جانے کیا سمجھتے ہیں

کسی کا پوچھنا کیا کام ہم کو گھر بلانے سے

کوئی ہم سے نہ پوچھے اب ہم اس کو کیا سمجھتے ہیں[1]

[1] کسی سے محبت کا آغاز میری زندگی میں، یونہی ہوا۔ فراقؔ

ہمیں مایوسیِ فرقت میں رو لینے دو جی بھر کے
نہیں ہوتا ہے کچھ رونے سے ہم اتنا سمجھتے ہیں

کسی کے جینے والے جی رہے ہیں اور عالم میں
سکوں کیا ہے کسے بیتاب ہو جانا سمجھتے ہیں

وہی جو تنگنائے زیست میں کچھ وسعتیں بھی ہیں
انھیں کو اصطلاحِ عشق میں صحرا سمجھتے ہیں

ہمارا حال سننے والے تیرے ضبط کے صدقے
یہ رہ رہ کے ترا ہم مسکرا دینا سمجھتے ہیں[۱]

۱۔ آگرہ جیل میں جب میں سیاسی قیدی تھا تو محبوب کے بہر ملاقات آنے کے عالم کی داخلی وخارجی مصوری اس شعر میں کی گئی ہے

فراق

جہانِ رنگ و بو بس چند ذراتِ پریشاں ہیں
بھرے گلزار کو اہلِ نظر صحرا سمجھتے ہیں

سبھی کے ساتھ ہیں سب کے شریکِ شادی و غم ہیں
ترے بے صبر آخر صبر کر لینا سمجھتے ہیں

یہ کوئی منصفی ہے تجھ کو الزامِ جفا دینا
نہ جانے غمگسارِ عشق تجھ کو کیا سمجھتے ہیں

فراقؔ اکثر کوئی ہر اک سے بیگانہ سا رہتا ہے
بس اتنے پر کسی کو لوگ دیوانا سمجھتے ہیں

۴۶

سنہ ۱۹۳۳ء

سمجھیں کیونکر بتائیں زندگی کو کیا سمجھتے ہیں

سمجھ لو سانس لینا خودکشی کرنا سمجھتے ہیں

کسی بدمست کو رازِ آشنا سب کا سمجھتے ہیں

نگاہِ یار تجھ کو کیا بتائیں کیا سمجھتے ہیں

بس اتنے پر ہمیں سب لوگ دیوانا سمجھتے ہیں

کہ اس دنیا کو ہم اک دوسری دنیا سمجھتے ہیں

کہاں کا وصل تنہائی نے شاید بھیس بدلا ہے

ترے دم بھر کے مل جانے کو ہم بھی کیا سمجھتے ہیں

امید دل میں بھی ان کی ایک شانِ بے نیازی ہے
ہر آسانی ہم کا جو دشوار ہو جانا سمجھتے ہیں

یہی ضد ہے تو خیر آنکھیں اُٹھاتے ہیں ہم اُس جانب
مگر اے دل ہم اس میں جان کا کھٹکا سمجھتے ہیں

کہیں ہو تیرے دیوانے ٹھہر جائیں تو زنداں ہے
جدھر کو منھ اُٹھا کر چل پڑے صحرا سمجھتے ہیں

جہاں کی فطرتِ بیگانہ میں جو کیفِ غم بھر دیں
وہی جینا سمجھتے ہیں وہی مرنا سمجھتے ہیں

ہمارا ذکر کیا ہم کو تو ہوش آیا محبت میں
مگر ہم قیس کا دیوانہ ہو جانا سمجھتے ہیں

نہ شوخی شوخ ہے اتنی نہ پڑ کار اتنی پر کاری
نہ جانے لوگ تیری سادگی کو کیا سمجھتے ہیں

بھلا دیں ایک مدت کی جفائیں اُس نے یہ کہہ کر
تجھے اپنا سمجھتے تھے تجھے اپنا سمجھتے ہیں

یہ کہہ کہہ آبلہ پا روندتے جاتے ہیں کانٹوں کو
جسے تلوؤں میں کرلیں جذب اُسے صحرا سمجھتے ہیں

یہ ہستی نیستی سب موج خیزی ہے محبت کی
نہ ہم قطرہ سمجھتے ہیں نہ ہم دریا سمجھتے ہیں

فراقؔ اس گردشِ ایّام سے کب کام نکلا ہے
سحر ہونے کو ہم بھی رات کٹ جانا سمجھتے ہیں

۴۳

سنہ ۱۹۲۱ء

تقدیر سہی اور تدبیر سہی جب تقدیر نہیں تدبیر نہیں
پھر جو بھی ہو میرے حصے میں تدبیر نہیں تقدیر نہیں

یہ راز و نیازِ حسن و عشق ہیں وصل کہاں فرقت کیسی
ہے کارگر اس میں اور ہی کچھ تدبیر نہیں تقدیر نہیں

یہ گردشِ دوراں اے ساقی ہے کس کی لغزشِ مستانہ
گردش کا سبب تدبیر نہیں لغزش کا سبب تقدیر نہیں

ہم دیکھ چکے ہم جان چکے ہم ایسوں کو پہچان چکے
سوئی بھی سہی تقدیر مگر ایسی سوئی تقدیر نہیں

کمیاب سہی نایاب سہی گمنام سہی بے نام سہی
تاثیرِ محبت کچھ بھی سہی پر کیا وہ دعا عالم گیر نہیں

کیوں چوٹ نہ دل کی اُبھر آئے کیوں زنداں یاد نہ آجائے
کیا موجِ ہوائے بہارِ چمن لہرائی ہوئی زنجیر نہیں

اکثر راتوں کو یہ کہہ کہہ کر اک درد کا مارا روتا ہے
سچ ہے کہ محبت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی تقصیر نہیں

مانا کہ نگاہ بھی قاتل تھی مانا کہ اُٹھی بھی تیری طرف
یہ حال ہوا جس سے اے دل ایسا بھی تو مارا تیر نہیں

جب دونوں باہم روٹھ چکے اس وقت کہیں یہ راز کھلا
تقصیر مری تقصیر نہیں تعزیر تری تعزیر نہیں

شبنم نے بھریں ٹھنڈی آہیں دل خون ہوا ہر غنچہ کا
کیا اُٹھتے درد کے عالم کی ہر موج صبا تصویر نہیں

ذراتِ پریشاں پہ دل کے اے مہر و ماہ اک عالم ہے
اور یوں تو چمکنے کو چمکی کس ذرے کی تقدیر نہیں

امید پہ جیتی ہے دنیا ہم ایسوں کا جینا رہ جانا
اے پوچھنے والے اس کے سوا کچھ بگڑی ہوئی تقدیر نہیں

اک درد بھری آواز نئی پھر بزمِ سخن کو رُلاتی ہے
یہ طرز فراق سے پھر نکلی کوئی کہہ دے طرزِ میر نہیں

۴۸

۱۹۴۵ء

ہوش رہتے ہوئے پیمانۂ دل بھر نہ سکیں
تجھے سب بھولے ہوئے یاد تری کر نہ سکیں

جینے والو کوئی جینے میں ہے یہ بھی جینا
کچھ بھی کر دھر نہ سکیں مٹ نہ سکیں مر نہ سکیں

کہنے کو عشق گیا ہو بھی نہیں پائے خراب
وہ گنہ کرتے ہی کیوں ہیں کہ جسے کر نہ سکیں

یہ نگاہِ غلط انداز بھی کیا جادو ہے
دیکھنے والے ترے جی نہ سکیں مر نہ سکیں

بھری محفل کو چھکا دے تو مگر اے ساقی
نیتیں ایسی بھی کچھ ہیں جو کبھی بھر نہ سکیں

ہو گئے مجبورِ محبت سے ہیں شاکی لیکن
اتنے آزاد نہ ہو جائیں کہ کچھ کر نہ سکیں

جیتے مُردوں سے جیا بھی جاتا ہے فراقؔ
موت بھی ان کی اگر آئے تو یہ مر نہ سکیں

۴۹

۱۹۳۹ء

اُسے کس بات کا شعور نہیں
چشمِ مخمور اِتنی چور نہیں

تیری نیرنگیِ طبیعت سے
عشق کی سادگی بھی دُور نہیں

سب کو ملتی نہیں یہ شدتِ ہوش
دلِ سوزاں چراغِ طور نہیں

جتنا دنیا نے مان رکھا ہے
اِس قدر فرقِ نار و نور نہیں
جو رگِ جان سے بھی ہے بڑھ کے قریب
کیوں بتہ اُس کا دُور دُور نہیں
منزلِ دوست پر ٹھہر جانا
مسلکِ قلب ناصبور نہیں
حسنِ محبوب کو بھی کیا کہئے
میری آنکھوں کا بھی قصور نہیں
عشق میں خوش بھی ہوتے ہیں لیکن
ایسا ہونا بھی کچھ ضرور نہیں

خبر اپنی نہ آج تک آئی
ارے میں اس قدر تو دُور نہیں

اتفاقات ہیں زمانے کے
ورنہ کچھ اہلِ غم سے دُور نہیں

عشق کرنا گناہ ہے کہ ثواب
کچھ میرے ہونے کے امید نہیں

حسرتِ مرگِ عشق ہے ان کو
جنھیں جینے کا بھی شعور نہیں

اہلِ دل کو خراب رہنے دے
تیری آنکھوں سے تو یہ دُور نہیں

خستگی مہر و ماہ کی مت پوچھ

کون پیمانہ ہے جو چور نہیں

اے فراق انقلاب عالمگیر

وقت کی مصلحت سے دور نہیں

تری جفائیں بھلا دوں تری وفائیں بھی

جو یاد آئے تو اے دوست تو ہی یاد آئے

۵۰

۱۹۴۳ء

اُنھیں رہ رہ کے اب آواز دیتی ہیں نئی راہیں
پرانی ہو گئیں اہلِ طریقت کی گزرگاہیں!

محبت کی مصیبت میری جاں المختصر یہ ہے
وہی ہم دونوں چاہیں پہ بعنوانِ دگر چاہیں

دلِ ہر قطرۂ شبنم بھر آیا بات اتنی تھی
کلی کے مسکرانے میں سنائی دے گئیں آہیں

اُنھیں کی بجیسی پر سنگ و آہن کو بھی حیرت ہے
تصور سے کسی کے تھر تھرا اٹھتی تھیں جو باہیں
جنھیں موجِ نسیمِ صبحگاہی ہم سمجھتے تھے
حقیقت کے بھی دل کو چیرتی جاتی ہیں وہ آہیں
ہمیں سے پستیاں اُبھریں ہمیں سے رفعتیں چمکیں
نہ پوچھو ہم سے اے ارض و سما ہم کون ہیں کیا ہیں
زمیں کی منزلوں سے آشنا ہونا مبارک ہو
کہ نہ افلاک کی راہوں سے مل جاتی ہیں یہ راہیں
فراقؔ اس دکھ بھری دنیا کو لوگ جانیں کیا سمجھا
اگر ہوں دیکھتی آنکھیں، درِ فردوس بھی وا ہیں

کبھی کبھی تجھے جب آنکھ اُٹھا کے دیکھا تھا

حریفِ عمرِ بقا تھے وہ نیم سے لمحے بھی

جو اُٹھ نہ سکا صبحِ ازل اپنے سہارے

یہ عشق وہی درد اُٹھانے کے لئے ہے

یونہی سہی اس سے کی مجھ سے شرح جب ہوتی تو ہوتی

سر دیدہ دیکھ اب میں اُداس رہتا ہوں

۵۱

سنہ ۱۹۳۸ء

بیخودی میں اک خلش سی بھی نہ ہو ایسا نہیں
تو نہ آئے یاد لیکن میں تجھے بھولا نہیں

عشق میں غافل وہ کیفیت وہ رنگینی نہ ڈھونڈ
درد کا اٹھنا نگاہِ ناز کا اٹھنا نہیں

حسن کی بیگانگی پر یہ وفورِ غم بجا
دل میں لیکن سوچئے تو عشق خود اپنا نہیں

ایسی بھی کیا احتیاطیں اے نگاہِ شوخِ یار
گدگدانا، مسکرانا، تیرے بس میں کیا نہیں

ہوش ہو، جوشِ جنوں ہو، غم ہو یا کیفِ نشاط
کون پیمانہ تھا جو اُس بزم میں چھلکا نہیں

جلوۂ دارو رسن آئینۂ رنگِ سکوت
لب کشائی پر حقیقت کا بھرم کھلتا نہیں

عشق جو چاہے کہے تیرے نہ سننے کو مگر
تجھ سے جو کہنا ہے کوئی راز بھی ایسا نہیں

یوں بھی آتی ہے قیامت اے خرامِ ناز یار
حشر کے بھی دنیا محبت کی تہ و بالا نہیں

ایک حالت پر زمانے میں نہ گزری عشق کی
درد کی دنیا بھی اب وہ درد کی دنیا نہیں

اک جہاں لاکھوں فسانے عشق سرتاپا سکوت
درمیاں رسوائیاں ہیں رازِ دل افشا نہیں

جس کے شعلوں سے بھی کل تنگ تھی بزمِ حیات
آج اُس خاکسترِ دل سے دُھواں اٹھتا نہیں

عشق کی بھی زندگی میں انقلاب آ ہی گیا
آج اُس کو دیکھ کر دل کا سکوں دیکھا نہیں

تفرقوں سے پاک ہیں آنسو محبت کے فراقؔ
حسن سرتاپا تغافل دوست و دشمن کا نہیں

۵۲

سنہ ۱۹۳۷ء

دھیان آنکھ پھیر لینے کے جو آئے ہوئے سے ہیں
یہ نقش بھی تو دل میں بٹھائے ہوئے سے ہیں

بادل سے اہلِ دل پہ جو چھائے ہوئے سے ہیں
اگلے زمانے یاد کچھ آئے ہوئے سے ہیں

مرہونِ احتمالِ تبسم ہے حیاتِ عشق
رو کے ہوئے ستم بھی تو ڈھائے ہوئے سے ہیں

بس جذبِ حسنِ یار کہیں پھر ابھر نہ آئیں
وہ نقشِ آرزو جو مٹائے ہوئے سے ہیں

تلوار سی جو تابشِ پنہاں سے ہے حسن کی
عشاق بھی لہو میں نہائے ہوئے سے ہیں

وہ درد کی طرح سے اُٹھے فتنہ ہائے حشر
یہ بھی کسی کے ناز اُٹھائے ہوئے سے ہیں

جا ہم نے تجھ کو دیکھ لیا اے نگاہِ یار
مسرور مست دل بھی دکھائے ہوئے سے ہیں

غم ہے کہ انتظار؟ سکوں ہے کہ اضطراب؟
آئے ہوئے بھی وقت نہ آئے ہوئے سے ہیں

آگے ترے فقط ہے یہ نذرِ و نیازِ عشق
خود کو تری نظر سے چھپائے ہوئے سے ہیں

تقریبِ دید میں غمِ ہجراں کی شدّتیں
محسوس ہو رہا ہے وہ آئے ہوئے سے ہیں

دیتی ہے وہ نگاہ اگر درسِ نیستی
ہم بھی متاعِ زیست لٹائے ہوئے سے ہیں

کیونکر ہو احتیاطِ نظر اُن کے سامنے
ہم کھوئیں یا نہ کھوئیں وہ پائے ہوئے سے ہیں

جلوہ نمائیوں میں جھجک کیا، حجاب کیا؟
انداز تیرے حسن کے بھائے ہوئے سے ہیں

جانِ نشاط بھی ہیں خزاں دیدگانِ عشق
کچھ شوخیِ بہار اُڑائے ہوئے سے ہیں

جو حسن بھی نہ سمجھے حیا والے ناز کو
وہ عشوۂ نہاں بھی سکھائے ہوئے سے ہیں

گویا ازل کے دن سے جہاں دیدگانِ عشق
دنیا کے سرد و گرم اُٹھائے ہوئے سے ہیں

اکثر سکوتِ ہجر میں گر غور سے سنیں
آتی ہیں یہ صدائیں ہم آئے ہوئے سے ہیں

ہم بدگمانِ عشق بھی کچھ اے سکوتِ ناز
سنتے ہیں تیری باتوں میں آئے ہوئے سے ہیں

بہلا رہے ہیں عشق کے احساس کو فراقؔ

دل سے کسی کی یاد بھلائے ہوئے سے ہیں

ایسے بھی ہیں جو دولت و ثروت سے چھپا رہے ملنے کو

رکھتے ہیں ان پہ جو دانت منہ کا مزا بدلنے کو

۵۳

سنہ ۱۹۳۷ء

ہو کر عیاں وہ خود کو چھپائے ہوئے سے ہیں

اہلِ نظر یہ چوٹ بھی کھائے ہوئے سے ہیں

اہلِ وفا دلوں کو بسائے ہوئے سے ہیں

دونوں جہاں کے درد اٹھائے ہوئے سے ہیں

رازآشنائے کیفِ فنا ہیں چراغِ دل

یہ جھلملانے والے بجھائے ہوئے سے ہیں

یہ مہر و ماہ گردِ سرِ راہ ہیں جہاں
ہم اُس گلی کی خاک اُڑائے ہوئے سے ہیں

ذوقِ نظر حدودِ فنا سے بڑھائیے
اہلِ ہوس بھی خود کو مٹائے ہوئے سے ہیں

وہ طور ہو کہ حشرِ دلِ افسردگانِ عشق
ہر انجمن میں آگ لگائے ہوئے سے ہیں

صبحِ ازل کو یونہی ذرا مل گئی تھی آنکھ
وہ آج تک نگاہ چرائے ہوئے سے ہیں

اک لرزشِ خفی بھی ہے تمکینِ حسن میں
رد کے ہوئے بھی تیر چلائے ہوئے سے ہیں

رسوائے دہر جس نے کیا ضبطِ عشق کو
ہم آج تک وہ درد دبائے ہوئے سے ہیں
گویا سنے ہوئے سے ہیں وہ داستانِ ہجر
ہم داستانِ ہجر سنائے ہوئے سے ہیں
چونکے ہوئے سے ہیں جو سکوں آشنائے عشق
دھوکے سے اُس نگاہ کے کھائے ہوئے سے ہیں
حسّاس کس قدر ہے محبت کی زندگی
ہم بے خبر ہیں اور اُنھیں پائے ہوئے سے ہیں
وہ سر بسر نہاں، وہ ز سر تا قدم حجاب
پھر بھی ہر اک نظر میں سمائے ہوئے سے ہیں

شاید کچھ اس میں شوخیِ بیگانگی بھی ہے
ربطِ نہاں وہ آج بڑھائے ہوئے سے ہیں

یوں تو بچے ہوئے سے ہیں گم گشتگانِ عشق
تیری نظر کی چوٹ بھی کھائے ہوئے سے ہیں

ہم بدگمانِ عشق تری بزمِ ناز سے
جا کر بھی تیرے سامنے آئے ہوئے سے ہیں

سنتے ہیں باخبر بھی ہیں تیرے ادا شناس
درپردہ کچھ فریب بھی کھائے ہوئے سے ہیں

کچھ ناتمام سے ہیں جو آثارِ ہستی
یہ درد بھی انھیں کے اٹھائے ہوئے سے ہیں

یہ قرب و بعد بھی ہیں سراسر فریبِ حسن
وہ آ کے بھی فراق نہ آئے ہوئے سے ہیں

شاید ترے غم نے کروٹیں لیں
حیرت زدگانِ عشق چونکے

خراب ہو کے اٹھا ہوں تری نگاہوں سے
مرا خیال ہے دنیا سنور گئی ہوگی

۵۴

۱۹۳۷ء

آنکھوں کی گلفشانیاں نہ گئیں

عشق کی شادمانیاں نہ گئیں

اب بھی ہے محوِ داستاں وہ نگاہ

میری جادو بیانیاں نہ گئیں

سرخوشی میں بھی چونک اٹھتا ہوں

تیرے غم کی نشانیاں نہ گئیں

حیرت افزا سکونِ عشق نہیں
حُسن کی بد گمانیاں نہ گئیں

اب تو زعمِ وفا مجھے بھی نہیں
کیوں تری سرگرانیاں نہ گئیں

قصۂ غم حریفِ شامِ ابد
عشق کی بے زبانیاں نہ گئیں

دمِ رخصت بھی بے رُخی اتنی
آپ کی مہربانیاں نہ گئیں

جب ستم اب کرم کا رونا ہے
عشق کی نوحہ خوانیاں نہ گئیں

موج نکلی لکیر ساحل کی تو
بحر کی بیکرانیاں نہ گئیں

خود الجھتا ہوں خود سلجھتا ہوں
دل کی ریشہ دوانیاں نہ گئیں

بے نیازی میں بھی ہے شانِ رضا
عشق کی حکمرانیاں نہ گئیں

دل ہے ڈوبا ہوا سا ضبط میں بھی
اشکِ غم کی روانیاں نہ گئیں

مضطرب ہجر بھی ہے وصل بھی ہے
حسن کی جانستانیاں نہ گئیں

حشر کا آفتاب تھرّا یا

تیری اُٹھتی جوانیاں نہ گئیں

اُف یہ محویت نگاہ فراق

رات دن کی کہانیاں نہ گئیں

کسی سے جور و نوازش میں فرق مشکل تھا

سبب کے محبت بھی آج روتی ہے

۵۵

۱۹۳۹ء

عشق کی دُنیا بھی وہ دنیا نہیں
اب تو تیرا درد بھی اتنا نہیں
انتظارِ نرگسِ مخمور دیکھ
اے محبت تیرے بس میں کیا نہیں
جنبشِ دیوارِ زنداں پر نہ جا
قیدیوں کو وہ سر و سودا نہیں

اہلِ غم کو تیرا پیمانِ وفا
یاد تو کیا ہے مگر بھولا نہیں

قافلے یا مٹ گئے یا بڑھ گئے
اب غبارِ راہ بھی اُٹھتا نہیں

اور کوئی بات ہے وجہِ سکوت
عشق کو تجھ سے کوئی پردا نہیں

ہے یوں ہی سی دل کو تشویشِ سحر
طولِ شامِ غم سے گھبراتا نہیں

تا ابد امروز ہی امروز ہے
عاشقی میں دوش یا فردا نہیں

خوش بھی ہو لیتے ہیں تیرے بیقرار
غم ہی غم ہو عشق میں ایسا نہیں

موت نے بھی جاننا چاہا مگر
زندگانی کا بھرم کھلتا نہیں

اِن جفاؤں پہ تری اے حُسن دوست
کیوں جفاؤں کا گماں ہوتا نہیں

معنی تقدیر تو وہ تھا کہ خود
کاتب تقدیر بھی سمجھا نہیں

تو نے اپنی بھی تو کچھ پرواہ کی
لیکن ایسا تو کوئی کرتا نہیں

جوشِ گریہ میں گدازِ عشق دیکھ
قطرے قطرے سے بنا دریا نہیں

تو نے سیاروں کو سمجھا آفتاب
بے خبر چنگاریاں شعلا نہیں

موت کا اُف وہ پیامِ زندگی
ایک دُنیا نے جسے سمجھا نہیں

درد ہی تو ہے محبت ہی تو ہے
راز ہی تو ہے اگر کھلتا نہیں

زندگی اے دوست غم کا نام ہے
یہ تو شاید شکوۂ بے جا نہیں

ماورائے درد و راحت عشق ہے
پر کوئی حسّاس بھی اتنا نہیں

ہاتھ ملتے ہیں خدا اور اہرمن
تیرا عاشق دین دنیا کا نہیں

مائلِ بیداد وہ کب تھا فراق
تو نے اُس کو غور سے دیکھا نہیں

آج آغوش میں تھا اور کوئی
ہم تجھے دیر تک نہ بھول سکے

—

۵۶

سنہ ۱۹۳۸ء

وہ کاوشِ نگاہ کسی پر عیاں نہیں
ہم کیا بتائیں درد کہاں ہے کہاں نہیں

عشق اس طرح مٹا کہ عدم تک نشاں نہیں
آ سامنے کہ میں بھی تو اب درمیاں نہیں

مٹنے کو کوئی قیدِ زمان و مکاں نہیں
مدّت ہوئی خلاف مرے آسماں نہیں

مجھ کو بھی اپنے حال کا وہم و گماں نہیں
تم راز داں نہیں تو کوئی راز داں نہیں

صیّاد اس طرح تو فریبِ سکوں نہ دے
اس درجہ تو مجھے بھی غمِ آشیاں نہیں

اس در گزر سے اور کھلا عشق کا بھرم
یہ کیا ہوا کہ مجھ سے وہ اب سرگراں نہیں

بچھڑے ہوئے اب اور ہی ڈھونڈیں دلیلِ راہ
اتنی بلند گردِ رہِ کارواں نہیں

محوِ سکوتِ ناز ازل سے ہے گوشِ عشق
قصّہ نہیں، فسانہ نہیں، داستاں نہیں

ہیں پرسشِ نہاں سے بھی عنوان سیکڑوں

اتنا تو اسکوتِ نظر سے زباں نہیں

اے دوست اہلِ درد کے رازِ سکوں نہ پوچھ

مدت ہوئی نگاہ تری مہرباں نہیں

کیا حشر دیکھئے ہو اب اس اعتدال کا

سنتے ہیں عشق درپئے آزارِ جاں نہیں

کیا حشر وعدہ کیا رگِ جاں کیا حریمِ راز

یہ جانتا ہوں تو ہے جہاں میں وہاں نہیں

ہمدم دیارِ دل کی جنوں خیزیاں ہیں اب

زنداں نہیں ہے دشت نہیں گلستاں نہیں

تھا حاصلِ حیات بس اک عشوۂ نہاں
اب یہ نہ پوچھ عشق کہاں ہے کہاں نہیں
سو بزم بے خودی نہ تری چشمِ نیم باز
یہ نشہ، یہ خمار، یہ آگاہیاں نہیں
سچ پوچھئے تو اپنی جگہ ہے نگاہِ دوست
مجبوریاں ہیں عشق کی وہ بدگماں نہیں
تو پھیر لے نگاہ کرم تو تری خوشی
اس درجہ شادماں تو دلِ شادماں نہیں
اے گردشِ سپہر تجھے ہم بھی دیکھتے
مائل اِدھر وہ نرگسِ آرام جاں نہیں

تو جانِ اضطراب سراپا سکوں بھی تو
اب یہ نہ پوچھ درد کہاں ہے کہاں نہیں

بچھڑے ہوؤں کو دھیاں ہزاروں طرح کے ہیں
دل محوِ نالۂ جرسِ کارواں نہیں

میں بیقرار ہوں تو فضا کیوں اُداس ہے
یہ زندگی ہے موت کی انگڑائیاں نہیں

صد جلوۂ بہار نثارِ شباب دوست
یہ کیف، یہ نشاط، یہ رنگینیاں نہیں

کیا واقعی فریب ہے اے دل حیاتِ عشق
کیوں مژدۂ وصال سے میں شادماں نہیں

ہستی کے انقلاب کو کیا کیجئے فراق
مانا کہ ہجر یار غم جاوداں نہیں

تم مخاطب ہو سامنے بھی ہو
تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں

۵۷

سنہ ۱۹۲۳ء

بھلا رکھا جنھیں تو نے وہ تجھ کو یاد کرتے ہیں
جہنم بھیلتے ہیں جنتیں آباد کرتے ہیں

بتا اے عاشقی تجھ کو قسم شام جوانی کی
کسی کے ہجر میں راتوں کو کیوں فریاد کرتے ہیں

سبق آموز ہیں بربادیاں ان کی بھی اے ہمدم
ہم اُن کے چاہنے والوں کو اکثر یاد کرتے ہیں

کہاں لے جاتی ہیں پل مارنے میں وحشتیں اس کو
جب اچھی آنکھوں والے کوئی دل آباد کرتے ہیں

نہ پوچھو کس طرح کٹتی ہے زنداں میں بہار اپنی
لہو دل کو یہ موسم ہائے ابر و باد کرتے ہیں

قیامت ہے قیامت دیکھنا تجھ کو نظر بھر کے
مگر یہ کام ہم اب ہر چہ بادا باد کرتے ہیں

بتا دے نزع میں یاد آنے والے او جفا پرور
تجھے ہم ایسے نازک وقت میں کیوں یاد کرتے ہیں

جگر دل پر نگاہِ ناز تمہیدِ تغافل ہے
کہاں آباد کرتے ہیں کہاں برباد کرتے ہیں

خدا رکھے دلِ سوزاں چراغِ خانہ تھا اکثر

فراقؔ اُس درد کی تصویر کو ہم یاد کرتے ہیں

عشق کیا حسن کا خلوصِ نہاں

حسن کیا عشق کی بس اک چمکار

جھوٹ اور سچ کی کہاں عشق سے بڑھ کر ہے مثال

جس کی ہر بات کی تردید بھی تصدیق بھی ہے

۵۸

۱۹۳۸ء

رنج و راحت، وصل و فرقت، ہوش و وحشت کیا نہیں؟
کون کہتا ہے کہ رہنے کی جگہ دنیا نہیں؟
ہاں اُٹھا آنکھیں کہ ہو کچھ پردہ داری عشق کی
اتنی رسوائے جہاں یہ نرگسِ رُسوا نہیں
لے اُڑی تجھ کو نگاہِ شوق کیا جانے کہاں
تیری صورت پر بھی اب تیرا گماں ہوتا نہیں

چل نہیں سکتے یہاں خوش بختیوں کے بھی فریب
عشق کا رونا ہے کچھ تقدیر کا رونا نہیں

دل بھی کہتا ہے ٹھہرنا ہجر میں دشوار ہے
میں بھی کہتا ہوں کہ یہ اندازِ غم اچھا نہیں

آج حسن و عشق جیسے ہو گئے ہوں مل کے ایک
تو نے وہ عالم نگاہِ ناز کا دیکھا نہیں

ہیں فریب احساسِ پنہاں کے سکون و اضطراب
عشق ہے وہ درد جو گھٹتا نہیں بڑھتا نہیں

اہلِ غم تم کو مبارک یہ فنا آمادگی
لیکن ایثارِ محبت جان دے دینا نہیں

حسن سر تا پا تمنا عشق سر تا سر غرور
اس کا اندازہ نیاز و ناز سے ہوتا نہیں

سر حدِ جذب و اثر سے حسنِ جاناں دور ہے
عشق کی دنیا ابھی شاید عشق کی دنیا نہیں

ہم بھی دیکھیں گے کبھی نازک مزاجی عشق کی
آج جس سے اک ذرا سا نازِ یار اٹھتا نہیں

اے نگاہِ بے محابا تو نے یہ کیا کر دیا
آج دل کو دیکھ کر میں نے بھی پہچانا نہیں

غور کر اس کیفیت پہ کچھ سمجھ یہ سوز و ساز
عشق میں دل درد ہو جاتا ہے دل دکھتا نہیں

اک اُداسی بھی لئے ہے کیوں نگاہِ نازِ یار
یہ پیامِ زندگی شاید کوئی سُنتا نہیں

میں عدم اندر عدم ہوں میں جہاں اندر جہاں
ایک ہی دنیا ہو میری اے فراقؔ ایسا نہیں

تیرا آجانا فکرِ شعر کے وقت
آج ترے بعد ہی بن آئی بات

۵۹

۱۹۳۷ء

شیرازہ دل کا یوں بھی پریشاں کیے چلو
بے چاک کے بھی جیب محبت سیے چلو
بادہ کشو اس آنکھ کا بس یہ پیام ہے
دونوں جہاں کی خیر مناتے پیے چلو
یوں بھی سنا ہے موت کو کرتے ہیں زندگی
جینے کا خیر نام ہے لیکن جیے چلو

شاید یہی حیات کی منزل کا راز ہے
تنہا چلو، جہان کو لیکن لئے چلو

آرام سے ہے کون سرِ رہگذارِ عشق
دل کو مگر فریبِ سکوں بھی دئیے چلو

یہ بھی ہے ایک رازِ سکوں اضطراب میں
چاکِ جگر کو سوزنِ غم سے سئے چلو

فرصت ضروری کاموں سے پاؤ تو رو بھی لو
اے اہلِ دل یہ کارِ عبث بھی کئے چلو

کیا بھاگ جاؤں گا میں کہیں لیکے وہ دیا
اے جانے والو ساتھ مجھے بھی لئے چلو

ہر گفتگو ہو اُس سے بجز عرضِ مدّعا
باتوں میں اے فراقؔ لبوں کو سیے چلو

حُسن خود قرب، عشق خود دُوری
یہ وصال و فراق دھوکے ہیں

حسن اک خوابِ ناز ہے جب سے
چونک پڑنے کو عشق سکتے ہیں

۶۰

سنہ ۱۹۴۶ء

دَورِ افلاک کا شباب ہے تُو　　آفتابوں کا آفتاب ہے تُو
نِتھری نِتھری سی موجِ برقِ جمال　　چھلکی چھلکی شرابِ ناب ہے تُو
جس کی راتیں طلسمِ خوابِ حیات　　اُسی وادی کا ماہتاب ہے تُو
جنمیں ہے ذکرِ طورِ یوسف و حشر　　انھیں آیات کا جواب ہے تُو
روپ ایسا حسین جیسے گناہ　　خلق کا حاصلِ ثواب ہے تُو
جو چھلکتا بھی جائے بھرتا بھی جائے　　ایسا پیمانۂ شراب ہے تُو

زم جھنکارِ سازِ قامت کی — اک کھٹکتا ہوا رباب ہے تو

تو جو صورت پکڑ لے ہے وہ خیال — یک بیک جاگ اُٹھے وہ خواب ہے تو

ہیں جو اوجھل نگاہِ غیب سے بھی — ان فضاؤں میں باریاب ہے تو

جو بہاروں کے دل سے اُٹھتے ہیں — اُنھیں شعلوں کا پیچ و تاب ہے تو

ہیں عبارت تجھی سے رنج و نشاط — ستم و لطفِ بے حساب ہے تو

طور ساماں لجلانے کے انداز — رشکِ جلوہ ہے وہ حجاب ہے تو

چمن اندر چمن ہے پہلوئے ناز — کس کھلے باغ کا گلاب ہے تو

یہ ستارے ترے پسینے کے — شب کا دہکا ہوا شباب ہے تو

عکس ہے کُہر چاندنی تیرا — دہکی راتوں کا ماہتاب ہے تو

پگھلی چاندنی میں شعلوں کی کروٹ — موجِ برق تہِ سحاب ہے تو

موجزن نرمیِ صباحتِ حسن — سینۂ کہکشاں کا خواب ہے تو
اُف، یہ مہکی ہوئی سہانی رات — چہرۂ شب کی آب و تاب ہے تو
اور پنہاں ہے حسنِ بے پردہ — اور پیدا تہِ نقاب ہے تو
جیسے زیرِ شفق چراغاں ہو — آج یوں مائلِ حجاب ہے تو
تجھ سے جوبن اُجالی راتوں پر — ماہتابوں کا ماہتاب ہے تو
رنگ رس اودھ کھلے شگوفوں کا — مسکراتا ہوا شباب ہے تو
جن پہ پڑتی نہیں خزاں کی چھاؤں — اُن بہاروں کی آب و تاب ہے تو
آنکھ پڑتی ہے اک زمانے کی — بزمِ امکاں میں انتخاب ہے تو
چشمِ مخمور پہ ہے آشنائی — انھیں باتوں سے تو خراب ہے تو
جیسے نغمے لبِ فراقؔ پہ سوئیں — سیج پہ یوں ہی محوِ خواب ہے تو

جس کو کہتے ہیں لوگ خواب گراں

ہے وہ خمیازہ جمال ترا

ہجر کو کے دن ہوئے، کسی کو

بھولتے بھولتے دن لگتے ہیں

کچھ ان آنکھوں کا مد لے کچھ ان ہونٹوں کا رس لے

عشق کے دکھ کا زہر ملا آب حیات یہی تے ہے

۶۱

۱۹۳۵ء

قفس میں آکے رو بیٹھے تھے جب صبحِ گلستاں کو
بہت سمجھا اسیروں نے سکونِ شامِ زنداں کو

بیاباں کر دے ہر ذرّے کو ذرّہ ہر بیاباں کو
نظر کو وسعتیں دے۔ لامکاں کر دارِ امکاں کو

یہ سامانِ جنوں لے کر چلا ہے کوئی زنداں کو
نگاہوں میں بیاباں کو کلیجے میں گلستاں کو

نہ آیا دوسرا دن قید میں اور جان دے ڈالی
مقدر تھا اسیرو دیکھ لینا شامِ زنداں کو

بہارِ چند روزہ کو بہارِ جاوداں کر دے
فریبِ رنگ و بُو سے کچھ الگ کر لے گلستاں کو

اشارے ہیں جنوں کے تیرے دیوانو لنسے زنداں میں
جب اُبھریں دل کی چوٹیں یاد کر لینا گلستاں کو

تماشائے چمن حسنِ چمن، رازِ چمن کیا ہے؟
بہانہ چاہئے کوئی جنونِ فتنہ ساماں کو

امید و یاس کی اے یادِ جاناں حد بھی ہوتی ہے
کوئی آزردہ ہو کر چھوڑ بیٹھا تیرے داماں کو

فریبِ حسن کھانا بھی نہیں ہر اک کی قسمت میں
کوئی کرتا ہے یاد اب تک کسی کے عہد و پیماں کو

درو دیوارِ زنداں دیکھ کر آنکھیں بھر آئی ہیں
کوئی یاد آگیا ہے تو گرفتارانِ زنداں کو

گلے کا ہار ہے مستی کا یہ چڑھتا ہوا دریا
تو سمجھا چاک کر دیتے ہیں لے کر ہر گریباں کو

زمین و آسماں رو کیں مکان و لامکاں رو کیں
گریبانِ عدم سے وحشیٔ دست و گریباں کو

کسی کا پَو پھٹے دنیا سے اُٹھنا، ہاں یہ ہونا تھا
کن آنکھوں سے کوئی کل دیکھتا تھا شامِ ہجراں کو

نگاہِ یار بزمِ ناز میں دیتی ہے نشہ کیا کیا
تغافلہائے پیدا سے نوازشہائے پنہاں کو

فراقِ نثار صدقے اس خرام اور اِن نگاہوں کے
مٹائے جا جگر دل کو دکھائے جا رگِ جاں کو

اگرچہ کچھ نہ کہیں گے مگر نہ رو سکیں اِس وقت
کچھ سے تجھ سے تجھے دے سکے گا کون الزام

۶۳

سنہ ۱۹۳۵ء

یہ فیضِ نیستی کیا کچھ نہیں ملتا ہے انساں کو
اگر توفیق ہو دارِ عدم کر دارِ امکاں کو

جہاں سے لے لیا ہیں نے گریبانِ گلستاں کو
وہیں سے چاک ہوتے دیکھ دامانِ بیاباں کو

محبت سہل ہے تو کیا ہوا پھر سہل ہونے دے
کبھی کچھ مشکلیں بھی حل رہیں گی عشقِ آساں کو

یہی تو پختہ کارانِ محبت پر بھی حیرت ہے
سمجھ کر بھی نہیں سمجھے وہ تیرے عہد و پیماں کو

وہیں سے ہیں رگیں وابستہ ہر وحشت بھرے دل کی
جہاں سے جنبشیں ملتی ہیں دامانِ گلستاں کو

ابھی تو کچھ خلش سی ہو رہی ہے چند کانٹوں سے
انہی تلووں میں اک دن جذب کر لونگا بیاباں کو

کسی کے وحشیوں نے کر لیا پیوند پیراہن
گریبانِ لحد کو دامنِ شہرِ خموشاں کو

عدم کی سرحدوں سے سرحدیں ملتی ہیں ہر جانب
کہاں کی وسعتیں دے دیں بساطِ بزمِ امکاں کو

مبارک اپنے ہی سر سے اب اپنے سر کو ٹکرانا
بہت شوریدہ سر ڈھونڈتے تھے زنداں میں بیاباں کو

ابھی سے ہے نظر انجام پر فرقت نصیبوں کی
کیے بیٹھے ہیں پہلے سے سحر دہ شامِ ہجراں کو
ادائے حسنِ آزردہ کے صدقے کوئی کیا سمجھے
مرے شک آلودہ مژگاں کو تبسم ہائے پنہاں کو
عنایت ہے، توجہ ہے، کرم ہے، لطف احساں ہے
مگر کیا کیجیے تیرے تغافلہائے پنہاں کو
فریبِ رنگ و بو کھا کر چمن سے ہاتھ دھو بیٹھے
ترے وحشی تو کب کے لے اُڑے ہوتے گلستاں کو
مری جمعیتِ خاطر فراقؔ اب یوں ہی ہوتی ہے
پریشاں اور کر لینا خیالاتِ پریشاں کو

۶۳

سنہ ۱۹۳۲ء

فراقؔ نامِ عدم پر لٹا دو دنیا کو
نہ رنگ لانے دو نیرنگیِ تمنّا کو
ہوئے ہیں دیکھ کے حیراں تری تمنّا کو
کہ تابِ دید کہاں عاشقانِ شیدا کو
شکستِ رنگ کے آئینہ دار بھی کچھ تھے
چمن کے پردے میں دیکھا جنوں نے صحرا کو

ہزار شکر کے پہلو خلوصِ عشق میں ہیں

سمجھ نہ اور کچھ ان شکوہ ہائے بے جا کو

دلِ حزیں کی بھی بربادیاں نہ پوچھ اے دوست

ملیں وہ نکہتِ گل کو نہ خاکِ صحرا کو

نہ قرب سے اسے مطلب غرض نہ دوری سے

کشش کچھ اور ملی ہے تری تمنّا کو ۔

جنھیں بہارِ گلستاں سے بوئے درد آئی

بجا بھی کہنے لگے خندہ ہائے بیجا کو

رہے نہ ہوش سرِ میکدہ ذرا ہشیار

لگے نہ ہاتھ کہیں دیکھ جام و مینا کو

میں بے نیاز ۔ سراپا نیاز بھی میں ہی
ہے ربطِ خاص مجھی سے تری تمنا کو
وہ حسن پردہ نشیں بھی، وہ حسن رسوا بھی
چھپے کلیم سے، پھونکے بھی طورِ سینا کو
نثار پرسشِ غم کے ترے کرم کے نثار
ہیں غیرتیں بھی کچھ اے دوست عشقِ رسوا کو
بتا کہ دولتِ کونین کیا کرے وہ دل
کہ تجھ سے بھی جو نہ بدلے تری تمنا کو
جو آئے وہ تو قیامت نہیں قیامت تو
وہ ہے کہ ہونے دے نہ روز جو نہ فردا کو

یہ رازِ تشنہ لبی عین آبِ حیوان ہے
سمجھ سراب کو دریا، سراب دریا کو

بتائیں کیا درو دیوار کی جنوں خیزی
یہ گھر وہ ہے کہ اٹھا لائے گھر میں صحرا کو

کبھی وہ رشکِ جنوں ہوش کو بھی کر دیگا
کیا ہے رشکِ خرد جس نے جوشِ سودا کو

نثارِ شانِ تغافل وہ دردِ فرقت دے
جو خود شناس بنا دے تری تمنا کو

جو حسن مائلِ تمکیں ہے مائلِ تمکیں
قرار بھی تو نہیں قلبِ ناشکیبا کو

گدازِ شیشۂ نازک ہے یا دلِ لرزاں
بھرا ہے عشق نے صہبائے تاب فرسا کو
نہ ہے یہ ربط پسند اور نہ احتراز پسند
ابھی سمجھتے نہیں تم مزاجِ دُنیا کو
وہ عشق کی نگہِ اولیں نہ پوچھ لے دوست
تڑپ ملی وہ کہاں برقِ طورِ سینا کو
خبر کچھ اُن کی بھی رکھتے ہو رنگ ڈبُو والو
جو کاٹتے چلے جاتے تھے راہِ صحرا کو
فراقؔ نے تجھے دیکھا تھا اُن کن آنکھوں سے
ہے آج تک وہی حیرت تری تمنّا کو

۶۴

سنہ ۱۹۳۷ء

کیفِ جمال دید میں عالمِ انتظار دیکھ
بزمِ طرب میں گردشِ نرگسِ پرخمار دیکھ

چشمِ سیاہکار دیکھ گردشِ روزگار دیکھ
کیفِ جمالِ یار میں دردِ فراقِ یار دیکھ

تابِ نظر کی فکر کیا ذوقِ نظر کا ذکر کیا
جلوۂ بیقرار دیکھ تابشِ بار بار دیکھ

ابرِ حجابِ ناز میں کوند رہی ہیں بجلیاں

تیرے سکونِ دل کی خیر عشوہ شرمسار دیکھ

لاکھ قیامتیں نثار ایک اس انقلاب پر

عالمِ عشق بدگماں رنگِ نگاہِ یار دیکھ

نیند سی آچلی ہے کچھ ہر دلِ بے قرار کو

دیکھ یہ رنگ بیخودی گیسوئے تابدار دیکھ

جس کا پیام زیرِ لب باعثِ خلقتِ جہاں

انہیں کی نظر کی زد پر آج عالمِ اعتبار دیکھ

نامِ بہار سے خزاں لوٹتی تا بہ کے چمن

آج خزاں کے بھیس میں آئی ہوئی بہار دیکھ

عشق کی پہلی زندگی عشق کے پہلے سوز و درد
بھول ۔ مگر ندامتِ حسنِ وفا شعار دیکھ
آگے قدم بڑھائے جا اور نگاہِ شوق بھی
دیکھ سوادِ شہر دوست اُٹھتا ہوا غبار دیکھ
برقِ نوائے راز ہے معنیِ رنگ و بوئے گل
حسنِ جمالِ یار میں سوزِ فراقِ یار دیکھ
دُور وہ جلوہ گاہ ہے عالمِ وصل و ہجر سے
یا وہ جمالِ دل فروز یا غمِ روزگار دیکھ
رازِ غمِ فراق کا اس سے کھلے گا کیا مگر
دیکھ سکوتِ بیخودی درد بھری پکار دیکھ

۶۵

سنہ ۱۹۴۲ء

بزم میں آج ان آنکھوں کا عالمِ بیخودی تو دیکھ
رنگِ فسوں گری تو دیکھ جادوئے سامری تو دیکھ

بادِ بہار بے قرار، روحِ بہار وجد میں
گیسوؤں کی لپٹ تو دیکھ مہکی ہوئی ہنسی تو دیکھ

جیسے چھلک پڑے جام سے بادۂ حیات
اُف یہ زمیں کی کروٹیں شانِ خرام کی تو دیکھ

لے کے دلِ نجوم کو ڈوبی ہے نبضِ کائنات
عالمِ صبحِ زندگی رات اگر کٹی تو دیکھ

آنکھ چُرائیں جس طرح تارے اندھیری رات میں
غم کی زیادتی تو دیکھ، آنسوؤں کی کمی تو دیکھ

دن سے تھے نکلتے بیٹھتے دُور بھی منزلِ خزاں
کلیوں کی سانس اُکھڑ گئی مانگے کی زندگی تو دیکھ

مُردوں سے شرط باندھ کے سوئی ہے روحِ انقلاب
شورشِ گیرو دار سے نیند اُچٹ گئی تو دیکھ

گام بہ گام مہر و ماہ، چاروں طرف شبِ سیاہ
دل کا کنول بجھا دے جو یہ نئی روشنی تو دیکھ

پلٹی ادھر نگاہِ ناز، دل سے ادھر دھواں اُٹھا
دولتِ دید لٹ گئی پھر بھی رہی سہی تو دیکھ

صحبتِ شب کی داستاں آہیں سمٹ کے آگئی
پچھلے پہر کو بزم میں شمع کی تھرتھری تو دیکھ

سیلِ سکوں نما ہے یا طرزِ خرامِ انقلاب
چڑھتی ہوئی ندی کا آج عالمِ کم رَوی تو دیکھ

بنتی ہے کیسے کائنات بے خودیِ نشاط سے
دردِ حیات کی طرح اس کی نگاہ اُٹھی تو دیکھ

بحثِ غم و نشاط میں، بیت گئی شبِ حیات
جاگنے والے سو گئے، حاصلِ زندگی تو دیکھ

ہونٹوں پہ کھیلتی ہنسی، نرگسِ ناز شبنمی
شکوۂ جور سب بجا اُس کی نگاہ بھی تو دیکھ

جیسے نشاط مسکرائے جیسے صباح تھرتھرائے
جیسے حیات رسمسائے حُسن کی تازگی تو دیکھ

جیسے پیامِ راز آئیں، شعلۂ ساز تھرتھرائیں
جیسے ستارے مل کے گائیں حُسن کی نغمگی تو دیکھ

جیسے سکوت تھرتھرائے، جیسے سکوت کچھ سنائے
جیسے سُگندھ مسکرائے حسن کی طرفگی تو دیکھ

یوں تو جمالِ دلفریب شام نہیں سحر نہیں
زلف کی ابتری تو دیکھ رُخ کی شگفتگی تو دیکھ

روحِ نوائے سرمدی آج ہے گوش برصدا
بزمِ سکوتِ شام میں حُسن کی نغمگی تو دیکھ

آنکھوں سے رہ رہ کے اُچھل آج کون یہ مسکرا دیا
غم کی فضائے تیرہ میں برق کی موج سی تو دیکھ

صاف اُفق مہک اُٹھا کِھل اُٹھا لہلہا اُٹھا
جیسے کِھلا ہوا کنول صبح کی تازگی تو دیکھ

مست کہوں کہ ہوشیار سروِ روانِ حسن کو
چال کی لغزشیں تو دیکھ آنکھوں کی آگہی تو دیکھ

جلوۂ رنگ رنگ میں بس تجھے دیکھتا رہا
رنگِ مزاجِ حسنِ یار عشق کی سادگی تو دیکھ

نیکی بدی کی فطرتیں دہر کی سب حقیقتیں
نامِ خدا بدل گئیں حسن کی کافری تو دیکھ

مجھ سے نگاہِ آشنا پرسشِ حال کر سکے؟

ہونے پہ سامنا کبھی، آنکھ بھی مل گئی تو دیکھ
قسمتِ عشق کو سراہ رو گئے ہوئے سرشکِ غم

پھر یہ کہاں جمال و دیدہ بعد کو رہ ابھی تو دیکھ
جیسے سکوت و گفتگو مل کے سنائیں داستاں

نرگسِ نیم وا میں ہے بات یہی، یہی تو دیکھ
یوں تو کہاں جمالِ یار اور کہاں یہ حالِ زار

کہنے کی بات ہے فراقؔ اپنی طرف کبھی تو دیکھ

اپنے گھر کا ہر اک راجا

عشق کا گھر پردیس ہے لیکن

شعورِ عشق کی تکمیل ہو چکی شاید

نہ بھولتا ہے کوئی اب نہ یاد آتا ہے

جو اضطراب ہے ست یہ وہی شکیب بھی ہے

ترا یہ درد سبھی تجھ سے کو یاد آ سکے

۶۶

۱۹۲۵ء

ہم جاگ رہے تھے سینے میں رہ رہ کے کھٹک سی ہوتی تھی

گھر اسناٹا چار طرف چھایا تھا دنیا سوتی تھی

باتوں میں کبھی جو کٹ جاتی تھی اب آنکھوں میں کٹتی ہے

یہ رات پہاڑ سی اک دن تھا جب کتنی چھوٹی ہوتی تھی

بے باک نظر کے ٹھوکر سے آنکھیں ملتی ہوئی جاگ اٹھی

او غافل اس ویرانے میں اک درد کی دنیا سوتی تھی

رہتی دنیا کی آوازیں آ آ کے جہاں سر پیٹ گئیں

وہ گور غریباں کی بستی کن گہری نیندوں سوتی تھی

کٹ جاتی ہے اب بھی کٹنے کو لیکن اک وہ بھی زمانہ تھا

جب رات رات ہی ہوتی تھی جب صبح صبح ہی ہوتی تھی

سوتے سے کسی کا اُٹھنا بھی اک عالم ہوتا تھا ہمدم

بکھرے ہوتے تھے بال آنکھ بھی نیند کی ماتی ہوتی تھی

وہ ڈوب ڈوب کے ابھر آنا وہ درد کی طرح چمک جانا

اے قاتل کسی معصوم کے خوں میں تیز چھری منھ دھوتی تھی

وہ رات فراق ہے یاد مجھے اب تک وہ صبح نہیں بھولی

بھیگے سٹے کتنی تھی جو ہوتے ہوتے ہوتی تھی

۶۷

سنہ ۱۹۲۴ء

سینۂ فراقِ زار کا دیکھو گے تم جو چیر کے
ٹکڑے ملیں گے جا بجا زہر میں ڈوبے تیر کے

حلقۂ چشم کی ترے یاد ہے بے خودی میں بھی
ساغرِ دل کے خط بنے عکس اِسی لکیر کے

یاد جو کوئی آگیا آنکھ بھر آئی دل دُکھا
پوچھ اثر نہ ہجر کے صدمۂ ناگزیر کے

آپ کے جاں نثاروں میں گن کے بڑے ہیں مرتبے
کچھ ہیں شہید تیغ کے کچھ ہیں شہید تیر کے

لذتِ زیست چاہیے جو درد میں ڈوب جائے وہ
ہیں یہ اشارۂ نہاں اُس کے کھٹکتے تیر کے

آنکھ کھلی تو ساقیا بزمِ طرب میں صبح تھی
پچھلے کو آگئی تھی نیند جب چلے دورِ اخیر کے

گو ہوں غریقِ بحرِ غم ابھروں گا اے فلک کبھی
ہاتھ تو بڑھنے دے اِدھر تو مرے دستگیر کے

شدتِ درد سے مجھے ہجر میں نیند آگئی
صدقے ہزار اضطراب تیرے کھٹکتے تیر کے

حُسن کہیں چلا ہے آج خاک بسر، برہنہ پا
فتنۂ حشر اُٹھ ذرا، لے لے قدم فقیر کے

پچھلے پہر کو ساقیا قول ترا یہ دے کے جام
گردشِ چرخ کیا دکھائے دور یہ ہیں اخیر کے

ہم بھی رہے ہیں بیقرار، ہم میں بھی اضطراب تھے
ہستیِ پُرخلش کے کچھ کچھ تری نوکِ تیر کے

درد رہا نہ اب فراقؔ درد کی وہ چمک رہی
سینے میں کچھ کرشمے تھے اُن کے کھٹکتے تیر کے

۶۸

سنہ ۱۹۳۷ء

کچھ نہ کچھ عشق کی تاثیر کا اقرار تو ہے

اُس کو الزامِ تغافل پہ کچھ انکار تو ہے

ہر فریبِ غمِ دنیا سے خبردار تو ہے

تیرا دیوانہ کسی کام میں ہشیار تو ہے

حسن رسوا سرِ ہر کوچہ و بازار تو ہے

کوئی عالم نہ ہو یہ عالمِ اسرار تو ہے

آج تک بھید کسی کو نہ ملا تھا نہ ملی
یہ تری نرگسِ مخمور خبر دار تو ہے

دیکھ لیتے ہیں سبھی کچھ ترے مشتاقِ جمال
خیر دیدار نہ ہو حسرتِ دیدار تو ہے

معرکے سر کر اسی قلبِ تپاں سے اے دل!
یہ چمکتی ہوئی چلتی ہوئی تلوار تو ہے

نہ سہی، دولتِ دنیا ترے جانبازوں کی
ملکیت صبحِ ازل سے رسن و دار تو ہے

سرِ ظلمتکدۂ دہر چراغاں کے لئے
گردشِ جام تو ہے محفلِ سرشار تو ہے

سر ٹپکنے کو پھٹکتا ہے مگر یہ رک رک کر

تیرے وحشی کو خیالِ در و دیوار تو ہے

دل کا بھی ٹھیک نہیں موت کا بھی ٹھیک نہیں

اب جئے وہ کہ مرے زیست سے بیزار تو ہے

کیوں ترے ناوکِ بیداد نے منھ موڑ لیا

لاکھ بیدل ہو مگر عشق جگر دار تو ہے

عشق کا شکوہ بجا بھی نہ بیکار گیا

نہ سہی جور مگر جور کا اقرار تو ہے

تجھ سے ہمت تو پڑی عشق کو کچھ کہنے کی

خیر شکوہ نہ سہی شکر کا اظہار تو ہے

اِس میں بھی رابطۂ خاص کی ملتی ہے جھلک
خیر اقرارِ محبت نہ ہو انکار تو ہے
ہم سے چھپنا ہی مناسب تھے اے برقِ جمال
پھونک دینے پہ تلی آہ شرر بار تو ہے
سحر و شام سر انجمنِ ناز نہ ہوا
جلوۂ حسن تو ہے عشق سیہ کار تو ہے
کئی عنوان ہیں ممنونِ کرم کرنے کے
عشق میں کچھ نہ سہی زندگی بیکار تو ہے
کیوں جھپک جاتی ہے رُہ رُہ کے تری برقِ نگاہ
یہ جھجک کس لئے اک کشتۂ دیدار تو ہے

کیفِ سامانیِ عالم کو اُن آنکھوں سے نثار

دلِ مدہوش تو ہے ساغرِ سرشار تو ہے

چونک اُٹھتے ہیں فراق آتے ہی اس شوخ کا نام

کچھ پراگندگیِ عشق کا اقرار تو ہے

قطعہ

زندگی درد زندگی درماں

اس میں انکار کا کہاں امکاں

زندگی کو غم و نشاط سے کیا!

زندگی زندگی ہے او ناداں!

۶۹

سنہ ۱۹۲۶ء

پیرہن ہی میں ترے وحشتوں کا ساماں ہے
پھاڑ لے گریباں ہے دیکھ لے گلستاں ہے

چاک چاک دامن ہے دھجیاں گریباں ہے
تار تار میں لیکن اک جہان پنہاں ہے

باعثِ گراں خوابی سوز و ساز پنہاں ہے
کیفِ خوابِ ہستی بھی کیفِ خوابِ زنداں ہے

وصل میں جو شاداں ہے ہجر میں جو گریاں ہے
وہ فراق کیا جانے کیا جمالِ جاناں ہے
عندلیب کی تقدیر کیسی نیند سوئی ہے
غنچۂ چمن سچ ہے خوابِ گُل پریشاں ہے
محوِ انتظار آنکھیں ہیں مری۔ مگر کس کی؟
جو نہ صاف ظاہر ہے جو نہ صاف پنہاں ہے
ہاں نہ جو نظر آئے سینے میں جو در آئے
دل میں جو اُتر آئے نشترِ رگِ جاں ہے
خواب گاہ میں تیری ہم ہیں نیند کے جھونکے
اک سکونِ بے پایاں ہستیٔ پریشاں ہے

موج بحرِ بے ساحل بحر ہی تو ہے غافل
ایک محیطِ لامحدود قیدِ حدِّ امکاں ہے

ایک رازِ ہستی ہے فرق ہے تو بس اتنا
حُسن میں وہ پنہاں ہے عشق میں نمایاں ہے

درد ہی تو ہے دل کا چوٹ ہی تو ہے دل کی
اُٹھ پڑے قیامت ہے بیٹھ جائے پیکاں ہے

اُس کا ملتفت ہونا، اُس کا مہرباں ہونا
چاہئے تو مشکل ہے سوچئے تو آساں ہے

ساز ہے جنوں کا دل، داغ ہے جنوں کا دل
بول اُٹھے تو بلبل ہے کھل اُٹھے گلستاں ہے

اور کیا کہوں اے دل تیری خیر سے گذرے
مہرباں ارے ناداں اب وہ دشمنِ جاں ہے

عمر کی روانی کیا؟ ایک بوند پانی کیا؟
موجِ خیزیِ ہستی اک خروشِ پنہاں ہے

قید کیا رہائی کیا ہے ہمیں میں سب عالم
رُک گئے تو زنداں ہے چل پڑے بیاباں ہے

اے فراقؔ انھیں پاکر ہم یہ دل میں کہتے ہیں
سوچیئے تو مشکل ہے دیکھیئے تو آساں ہے

۷۰

سنہ ۱۹۲۶ء

نکلا تو ہوں بچا کے میں برقِ نظر تری
مجھ کو نہ خاک کر دے کہیں رہگذر تری

آخر فراق بن نہ گئی جان پر تری
کمبخت پڑ گئی نہ کسی پہ نظر تری

موجِ ہوا کے ہاتھ میں ہے دامنِ بہار
سر پیٹتا ہے کوئی اکھڑا راہ پر تری

کیا پردہ داریاں ہیں تری اے نگاہِ مست

تہہ پا سکا کوئی بھی نہ اسے بے خبر تری

دل خون ہو کے سینے میں سو بار رہ گیا

رنگینیاں دکھا گئی کیا کیا نظر تری

کچھ لڑکھڑا رہی ہے نسیمِ بہار بھی

اُٹھتی چلی ہے سوئے گلستاں نظر تری

اک وقت ہوگا ہم سے جو دیکھا نہ جائے گا

ہم جانتے ہیں اے شبِ ہجراں سحر تری

ناکام جا رہے ہیں تری بزمِ ناز سے

ہم تیرہ بخت آئے تھے امید پہ تری

اے وعدہ کرکے بھولنے والے ترے نثار
جینا پڑے گا کتنے دنوں بات پر تری

مجھ کو جلانے کے لئے اللہ رے اہتمام
اک برق زار بن کے اٹھی ہے نظر تری

کیفیتوں میں ڈوبی ہوئی اے نگاہِ مست
کیا رکھیں تیرے دیکھنے والے خبر تری

یہ سوز ساز اے غمِ ہستی ترے نثار
تصویر بن کے رہ گئی شمعِ سحر تری

صبحِ شبِ فراق ہوئی اور ابھی فراق
بیٹھا ہے اپنے گھر کو کئے رہگذر تری

۱۷

۱۹۲۴ء

وہ روٹھنا ترا آج آرہا ہے یاد مجھے
کہا تھا میں نے نہیں تیرا اعتماد مجھے

پکڑ لیا سرِ محشر کسی نے ہاتھ مرا
بس آج مل گئی اپنی وفا کی داد مجھے

یہ انقلاب دلوں کا کبھی کم ہوا ہوگا
نہ میں ہوں یاد انھیں اب نہ تم ہو یاد مجھے

نہیں کہ غیر ستائے تو میرے ہو جاؤ
یہی بہت ہے کہ اس وقت کر لو یاد مجھے

ترے فراق میں اے یار شام کی دنیا
دلا رہی ہے کسی غمکدے کی یاد مجھے

وہی بتائیں کہ رسوائیاں بڑھیں کیسے
جو سب میں کہتے پھرے بانیِ فساد مجھے

وہ آنکھ پھر گئی خیر ایسی ہی تھی گردشِ بخت
مگر ہیں پہلی نگاہیں کسی کی یاد مجھے

خطاب پھر نہ کیا تیری بے نیازی سے
تھکی تھکی سی وہ عرضِ وفا ہے یاد مجھے[1]

[1] دائمی جدائی ہونے سے پہلے آخری ملاقات کی یادگار ہے یہ شعر۔ فراق

سلامِ شوق کہا ہے فراقؔ نے تجھ کو
ملا تھا مدتوں پہ کل وہ نامراد مجھے

اُداسی میں محبت کا فسانہ چھیڑ اے ہمدم
وہ سمجھے جب داستاں اب سے دل اُسی سے جی بہلتا ہے

۷۲

سنہ ۱۹۲۵ء

اب نہ داماں ہے کوئی نہ گریباں کوئی
منزلوں چھوڑ گیا باغ و بیاباں کوئی

جس طرح تار میں نغمہ ہے نہاں پھول میں بُو
میری رگ رگ میں اسی طرح ہے پنہاں کوئی

کچھ تجاہل بھی مرے ذکر پہ کچھ شرم بھی ہے
کیا ہوں میں بھی ترا ٹوٹا ہوا پیماں کوئی

یہ بھی سچ ہے کہ ہم آوارہ و سرگرداں ہیں
یہ بھی سچ ہے کہ ہمارا نہیں پرساں کوئی

عشق اب حسن کی تصویر ہوا چاہتا ہے
اور چاہے تو رہے آج بھی پنہاں کوئی

داغِ دل بادِ بہاری کے ابھر آئے ہیں
آہ سمجھا ہی نہیں رازِ گلستاں کوئی

بیخودی آ چلی اے دوست غمِ فرقت میں
شدتِ درد نہ اب حاجتِ درماں کوئی

نہ عدم ہوں نہ شبِ تار نہ خلوت گہہ ناز
میں تو کچھ بھی نہیں کیوں مجھ میں ہو پنہاں کوئی

کہیں اُٹھتے ہیں کہیں پڑتے ہیں پائے رنگیں
مجھ تک آتا ہے بہ اندازِ گریزاں کوئی
نہ جوانی ہے نہ دل۔ رات گئی بات گئی
اب شبستاں ہے نہ ہے شمعِ شبستاں کوئی
دلِ گم گشتہ کی آتی ہے مجھے یاد فراقؔ
جب نکلتا ہے بچائے ہوئے داماں کوئی

۷۳

سنہ ۱۹۳۶ء

اب ختم ہو عتاب کہیں رحم آ چکے
گستاخ عشق خون میں اپنے نہا چکے
مدّت ہوئی کہ یاد کسی کی بُھلا چکے
حرماں نصیب ہجر کے صدمے اُٹھا چکے
کب سے لرز رہی ہے فضا کائنات کی
اے حُسنِ شرمسار تجھے شرم آ چکے

اب ماوراے وہم و گماں ہے سکوتِ حسن
وہ سُن چکے فسانۂ غم، ہم سُنا چکے

گزرے گا ہو کے شہرِ خموشاں سے آج کون
سو مرتبہ چراغِ لحد جھلملا چکے

اب حسن کی گھٹیں کہ بڑھیں فتنہ خیزیاں
مدت ہوئی کہ ہوش میں دیوانے آ چکے

پُرپیچ اور عقدۂ ہستی کو کر دیا
وہ آئینے میں گیسوے پُرخم بنا چکے

اے دل یہ کہاں کی بات نکالی کہ اب انھیں
اگلے دنوں کے لطف و کرم یاد آ چکے

اُن کا بھی کیفِ تمکنتِ حُسن بڑھ گیا
اپنے بھی نالے عرش کے پائے ہلا چکے

جلدی بھی ہے پیام پہنچنے کی ڈر بھی ہے
پیغامبر پیام کو لے کر نہ جا چکے

دل پر کبھی فریب سکوں کے بھرم کھلیں
یوں ہی قضیۂ غمِ صبر آزما چکے

اب اور رنگِ عالمِ امکاں نظر میں ہے
آنکھوں میں اس دیار کے جلوے سما چکے

پھر شوقِ وصل و حوصلۂ دید پوچھنا
کچھ راہ پر مزاجِ غمِ ہجر آ چکے

بیتابِ دید آج بھی بیتابِ دید ہیں
وہ سو طرح جمالِ خود آرا دکھا چکے

اے دل حیاتِ عشق کا پانا محال ہے
ہم جانِ تنگ تو اپنی اسی میں گنوا چکے

تقدیر میں ہر اک کی یہ برقِ ادا نہیں
تجھ پہ وہ اے فراقِ حزیں مسکرا چکے

۷۴

۱۹۳۶ء

ہم کو یہ ڈر کہ وقت نہ رخصت کا آچکے
مدّت ہوئی وہ ہاتھوں سے دامن چھڑا چکے
بیتے دنوں کے لطف و کرم یاد آچکے
آنکھوں میں آج اشک سے کچھ تھرتھرا چکے
ہم سوچتے ہیں یاد کسی کی بھلا چکے
دل پر بھی کچھ خبر ہے کہ یا دل سے چھا چکے

اِن گردشوں میں کاوشِ صبر و سکوں ہے اب
آوارگانِ دشتِ جنوں خاک اُڑا چکے

ممنونِ انقلابِ غمِ روزگار ہوں!
صبر و قرار، ہوش و خرد جا کے آ چکے

اب تک جہانِ گورِ غریباں خراب ہے
آسودگانِ خاک کو اب نیند آ چکے

آوارگانِ غم کو ٹھکانا ملے کہیں
دامانِ دشت کو بھی گریباں بنا چکے

ٹھہرے ہوئے دل آج بھی کچھ منتظر سے ہیں
تیرِ نگاہِ ناز نشانے اُڑا چکے

اک شوخیِ نہاں بھی سکوتِ نظر میں ہے
ہم ماجرائے دردِ محبت سُنا چکے

اب عشق ہی رُلائے تو کچھ رو سکیں۔ کہ وہ
ہم بے کسانِ رنج و الم کو رُلا چکے

تجھ کو بھی کچھ ہے معرکہ آرائیوں کا ہوش
لب تشنگانِ برقِ نظر کام آ چکے

اے حُسنِ بے نیاز یہ حالت بھی تا بکے
دشمن کو دوست، دوست کو دشمن بنا چکے

سمجھے ہوئے تھے ہم سفرِ زندگی جنھیں
وہ کاروانِ درد بھی منزل پہ جا چکے

اس شوخیِ نہاں سے پناہ اے خدائے عشق
کھوئے نہ ہم گئے تھے ابھی اور وہ پا چکے
رہ رہ کے ابتک آگ لگاتے تھے جو فراق
وہ قطرہ ہائے اشک بھی دریا بہا چکے

ہم اہلِ درد طور سے آگے نکل گئے
پتھر ہماری راہ میں جب تک نہیں رہا

۷۵

سنہ ۱۹۴۳ء

لپٹی ہوئی قدموں سے ہو وہ راہگذر بھی
ایک ایک قدم جس میں ہے منزل بھی سفر بھی
افسانہ در افسانہ ہے گویا وہ نظر بھی
کچھ کہنے کو ہے جیسے بعنوانِ دگر بھی
ہر سانس میں آتی ہے عجب دل کی خبر بھی
کچھ ساکن و ساکت بھی ہے کچھ زیر و زبر بھی

بیگانہ تھا کچھ حسن بھی کچھ میری نظر بھی
اک آگ لگی کل سے اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
بچ بچ کے تو صد چاک کیا دل بھی جگر بھی
تیری نگہِ ناز کہیں جائے اُتر بھی
اے نرگسِ مخمور ابھی دنیا نہیں بدلی
اک گردشِ مستانہ باندازِ دگر بھی
بربادیِ دل کی تو امیدیں نہ تھیں لیکن
کچھ گردش ان آنکھوں کی بھی کچھ دَورِ قمر بھی
اُچٹے ہوئے دل پھر بھی ہیں اٹکے ہوئے کیا کیا
دنیا ہے عجب جا کہ پردیس بھی گھر بھی

اس درجہ نہیں بیکسیِ شامِ غم اپنی
اُٹھ جاتے ہیں تاروں کے اِدھر دیدۂ تر بھی

اے دوست یہ عالم ہے خرابات کا عالم
رکھتی نہیں یہ آنکھ تری اتنی خبر بھی

ہلکی نہیں اس درجہ قبا زہد کی زاہد
ناکردہ گناہوں کے ہیں کچھ دامن تر بھی

کچھ بوئے کفن آتی ہے پچھلے کی ہوا سے
پنہاں ہے شب تار میں پیغامِ سحر بھی

گذرا ہے فراقِ وطن آوارہ اِدھر سے
کچھ چاک گریباں بھی تھا کچھ خاک بسر بھی

۷۶

سنہ ۱۹۳۲ء

ہستی کو بنا دینا اے عشق کی بے اثری

اک دوزخِ بے تابی اک جنتِ بے خبری

گھٹتی نہیں ہشیاری، بڑھتی نہیں بے خبری

قسمت کی بھی کوتاہی ساقی کی بھی کم نظری

جب جب اُسے سوچا ہے دل تھام لیا میں نے

انسان کے ہاتھوں سے انسان پہ جو گزری

لہ یہاں قافیے کے ساتھ میں نے ذرا زیادتی کی ہے — فراقؔ

درسا ہوا آئینہ، چٹکا ہوا پیمانہ!

ٹوٹے ہوئے دل کی بھی یہ حیرت و بے خبری

کچھ ترک و غنا لے لے، کچھ فقر و فنا لے لے

ہاں راہِ محبت میں سامان ہوں سب سفری

ممکن ہو تو سوچے جا، ممکن ہو تو دیکھے جا

ہوتے ہوئے آنکھوں کے انسان کی بے بصری

گھٹتی ہی چلی جائے امیدِ شکیبِ دل

بڑھتی ہی چلی جائے اُن آنکھوں کی بے خبری

بیدادِ ستمگر نے ہستی ہی بدل ڈالی

اس پر بھی نہیں چونکے اللہ ری بے خبری

اب یاد نہیں یہ بھی، کیا درد محبت تھا
کچھ بیدلی اپنی بھی کچھ دل کی بھی بے جگری
"یہ نیستی ہستی افسانہ ہے افسانہ"
افسانہ بھی وہ جس کی کچھ پوچھ نہ بے اثری
ساغر ہو کہ نرگس ہو ذرّے ہوں کہ تارے ہوں
ہر آنکھ میں دیکھا ہے اک عالم بے خبری
ارمان بھرے دل کا اب ذکر نہ کر ہمدم
وہ فصل چمن آئی، وہ فصل چمن گزری
تہ جن کی نہیں ملتی دل ہے انھیں آنکھوں کا
گم کردۂ ہشیاری وارفتۂ بے خبری

یہ کیسی کشاکش میں ہے عشق کی غیرت بھی
شرمندۂ ہشیاری، منت کش بے خبری

یا کچھ بھی نہ بھولا تھا یا یاد نہیں کچھ بھی
ہشیاری تو ہشیاری، بے خبری تو بے خبری

اب ذکر نہیں دل کا دیکھا نہ فراق آخر
اُن آنکھوں کی ہشیاری، اُن آنکھوں کی بے خبری

۷۷

سنہ ۱۹۱۹ء

مجھ سے اگر جدا ابھی ہوئے تم تو کیا ہوئے
رونا تو ہے اسی کا کہ لڑ کر جدا ہوئے

تکلیف پردہ داری الفت نہ اُٹھ سکی
شاکی کسی کے جور کے ہم برملا ہوئے

سوئے ہوئے نصیب نہ جاگے ہمارے حیف
ہنگامے تیری چال سے لاکھوں بپا ہوئے

کیوں تیری جلوہ گہ میں نوا ہائے دل ہیں بند
یہ ساز بزم ناز میں کیوں بے صدا ہوئے

پاتے جو ہم تجھے تو خدا جانے ہوتے کیا
کھو کر تو ہم تجھے دلِ بے مدّعا ہوئے

مجبوریاں کسی کی نہیں بھولتیں ہمیں
چرچے ہمارے عشق کے جب جا بجا ہوئے

جی بھر کے دیکھتے بھی نہ پائے تھے ہم تجھے
تجھ پر نثار دل سے مگر بارہا ہوئے

مستِ ازل جو بادۂ گلگوں نہ پی سکے
وہ اچھی آنکھوں والوں کی شاید حیا ہوئے

چینِ خفی وہ ابروؤں پر تیرے ہائے ہائے
آزردہ تیری بزم میں جب ہم ذرا ہوئے

ٹوٹا دل اس طرح کہ خدا یاد آگیا
اس آئینے کے ٹکڑے سبھی حق نما ہوئے
دل کا اب اور ساتھ وہاں دے نہیں سکے
ہم آج اس غریب سے رد کر جدا ہوئے
اب بارِ زیست کا بھی اٹھانا ہوا محال
ہم جرمِ عشق کر کے کسی کی حیا ہوئے
باقی نہیں ہے اب ہمیں برقِ نگاہِ یار
اُف دیکھتے ہی دیکھتے ہم کیا سے کیا ہوئے
گو عشق کو نہ سمجھے غمِ ہجر میں فراق
یہ تو ہوا کہ حُسن کے راز آشنا ہوئے

۸۷

سنہ ۱۹۳۶ء

وابستہ ہیں تجھی سے سب ارمانِ دوستی
تو جانِ دوستی ہے تو ایمانِ دوستی

اس احتیاطِ حُسن کا اے دل بُرا نہ مان
یہ کم نگاہیاں ہیں نگہبانِ دوستی

کچھ عشقِ بے قرار بھی شرمندہ ہو چلا
اُٹھتی چلی وہ نرگسِ حیرانِ دوستی

کن مشکلوں میں شکوۂ بیجا ہے عشق کا
پیدا ہے جورِ حُسن سے بھی شانِ دوستی

ہم باغِ خلد کو بھی نہ لائیں خیال میں
ہاتھ آئے گر ترا سرِ دامانِ دوستی

اُٹھتی ہے پھر نگاہِ کرم مدّتوں کے بعد
لے کر جلو میں صد سر و سامانِ دوستی

ہر سو چمن چمن تری اے نو بہارِ ناز
پھیلی ہوئی ہے بوئے پریشانِ دوستی

یادِ نگاہِ یار پھر آئی لئے ہوئے
سامانِ صد جراحتِ پیکانِ دوستی

اِس شوخیٔ نہاں سے پناہ اے خدائے عشق
بدلے ہی جا رہا ہے وہ عنوانِ دوستی

کھلتا نہیں ہے صاف پیامِ نگاہِ لطف
اک تیرِ نیم کش ہے یہ پیمانِ دوستی

مصروفیت تغافلِ آہوئے ناز کی
فرصت نہ دشمنی کی نہ امکانِ دوستی

اتنا بھی رشکِ قسمتِ اغیار کیا کریں
یہ بھی ہیں کوئی دن ترے مہمانِ دوستی

اب اور کیا کہیں کہ ہم اہلِ رضا سے بھی
آخر نہ اُٹھ سکے ترے احسانِ دوستی

اس چشمِ نیم باز میں پنہاں ہیں اے فراقؔ
صدہا فریبِ مشکل و آسانِ دوستی

۷۹

سنہ ۱۹۳۷ء

وفورِ شوق کو شوخیِ حسن راہ تو دے
یہ برقِ جلوہ تری فرصتِ نگاہ تو دے

رہے گا کھل کے کبھی رازِ ہوش و غفلت بھی
پتہ کچھ اپنا سیہ مستیِ نگاہ تو دے

دل اپنا ڈوب چلا جب تو ذکرِ ساحل کیا
یہ ناؤ بیٹھ کے دریائے غم کی تھاہ تو دے

غم و خوشی میں ترے حسنِ بے پناہ کی خیر
تباہ حال دلوں کو کہیں پناہ تو دے

علاجِ خوبیِ تقدیرِ عشق کیا ہمدم
وہ دل سے عہدِ وفا باندھ کر نباہ تو دے

بتائے کون خموشی کو داستاں کرنا
کہ یہ پیامِ نہاں دے تری نگاہ تو دے

اک آہ سرد سہی اک نوائے درد سہی
یہ ضبطِ غم کبھی بے چارگی کو راہ تو دے

ہر اک کے ہوش کا کھل جائے گا بھرم ساقی
کچھ اذنِ بادہ کشی مستیِ نگاہ تو دے

بجا بجا یہ ہر انداز کیف و مستی کا
خبر کچھ اپنی مگر نرگسِ سیاہ تو دے

نہیں ہے چین جو قسمت میں اے غمِ جاناں
کشاکشِ غمِ دنیا سے کچھ پناہ تو دے

رہی ہے راز سراسر اگرچہ فطرتِ حسُن
ہوا کسی کو مگر دامنِ نگاہ تو دے

تمام عمر اسی انتظار میں گزری
کہ نازِ حسن کو بے تاب عشق راہ تو دے

ظہورِ حسُن سہی عالمِ شہود سہی
پتہ مرا بھی کہیں تیری جلوہ گاہ تو دے

کسی کی رنجشِ بے جا سے دل بھی نادم ہے
کچھ آج اپنی صفائی یہ بے گناہ تو دے

حجابِ حسن کو بے باک بھی بنالیں گے
پتہ کچھ اپنا تری شرمگیں نگاہ تو دے

سروں سے کھیلتی موجِ فنا گزر جائے
اُترنے والوں کو دریائے عشق تھاہ تو دے

نہ بے قرار رہے گا نہ باقرار کوئی
پیامِ ہوش ربا گردشِ نگاہ تو دے

ذرا دو راہۂ ہجر و وصال سے بچ کر
فراقؔ دل میں کبھی اپنے دل کو راہ تو دے

۸۰

سنہ ۱۹۳۴ء

کچھ اور اب اپنی زندگی ہے
یہ دوستی ہے یہ دشمنی ہے!

آئی ہوئی نیند زندگی ہے
پندارِ خودی کبھی بیخودی ہے

اے دوست یہ کوئی زندگی ہے
جو تجھ سے بچھڑ کے کٹ رہی ہے

کیا کہئے کہاں ہے اپنی منزل
تلوؤں میں ہے جذب دُور بھی ہے

خاموش ہوں پرسشِ نہاں پر
تفصیل بھی اختصار بھی ہے

بس شکوۂ دوست ہے تو اتنا
نیکی میرے لئے بدی ہے

پنہاں ہے جو حُسنِ جانستاں میں
دکھتی ہوئی چوٹ عشق کی ہے

ہر سانس ہے مرگِ ناگہانی
اب اپنی حیاتِ زندگی ہے

دریا بھی ہوں میں سراب بھی ہوں
ساقی یہ کمالِ تشنگی ہے

یہ ہستیِ ننگِ دہر اے دوست
سرمایۂ نازِ دہر بھی ہے
ہے حسن صدا بہار اے دل
تو عشق صدا سہاگ بھی ہے
دے جی کے ثبوتِ مرگ ناداں
مرنے کی ہوس کم آگہی ہے
اے دردِ فراق، اے غمِ یار
بیتاب بھی ہوں میں صبر بھی ہے
وحشت پہ فراق کی نہ جانا
اک یہ بھی ادائے بے خودی ہے

۸۱

۱۹۲۸ء

جیتے جی عشق کی دنیا میں مر جانے کی صورت بھی دیکھی
اس دل کے ارادے بھی دیکھے اُن آنکھوں کی نیت بھی دیکھی

جس قید سے چھٹتے بھی نہ بنے وہ قیدِ محبت بھی دیکھی
جینے کی مصیبت بھی دیکھی مرنے کی ندامت بھی دیکھی

دیکھا ہی نہیں کام اپنا تمام اک برقِ نظر میں ہو جاتا
ہم خاک نشینوں سے اے قاتل تیری کدورت بھی دیکھی

بس دیکھتے ہی بنتی تھی وہ حسن و عشق کی معرکہ آرائی
اُس شوخ کے تیور بھی دیکھے اس دل کی جسارت بھی دیکھی

جو تیر کی جانب خود بھاگے ہے دل بھی ہرن کس صحرا کا
اے اچھی آنکھوں والو تم نے ایسی وحشت بھی دیکھی

کیا رنگِ طبیعت ہے اُن کا کیا دل میں یہ سوچا کرتے ہیں
روتے روتے دیوانوں میں ہنس دینے کی عادت بھی دیکھی

اک خون کی بوند میں درد کی دنیا دیکھ لی میری آنکھوں نے
دنیا والے دل کہتے ہیں جس کو اس کی وسعت بھی دیکھی

بیگانۂ لیلےٰ بھی ہو کر اے قیس صدائے انا لیلےٰ
آزادیِ وحشت بھی دیکھی یہ قیدِ محبت بھی دیکھی

دم توڑتے وقت بھی ایک نظر کو مرنے والے ترس جائیں

غم کشتوں سے اے چشمِ دوست۔ جا۔ تیری مروّت بھی دیکھی

کچھ کھویا ہوا کچھ دُکھتا ہوا راحت ہے فراقؔ نہ کلفت ہے

جو دیکھی جائے نہ آنکھوں سے اس دل کی وہ حالت بھی دیکھی

چپ ہو گئے تیرے رونے والے

دنیا کا خیال آ گیا ہے

۸۳

۱۹۳۶ء

کیا راہ ہے راہِ محبت کی سانس آتے آتے ٹوٹ گئی
کیا بار ہے بارِ محبت کا دو گام میں ہمّت چھوٹ گئی
وہ درد وہ چوکھٹ کیا چھوٹی عشاق کی قسمت پھوٹ گئی
چاہا تھا کہ دل کو سنبھالیں کچھ سوچ کے ہمّت چھوٹ گئی
زنداں کی حقیقت ہی کیا تھی ہمّت ہی یکایک ٹوٹ گئی
دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا دیوانوں کی قسمت پھوٹ گئی
تسکین کی باتیں کرتے ہو ہم جانتے ہیں جو ہونا ہے
جب اُس سے بچھڑ کر جینا ہے تو یار و قسمت پھوٹ گئی

چاہا تھا جسے دیکھتے دل سے اس کی بھی نگاہ کبھی ہو گی

اُس شخص کی قسمت کیا کہئے یہ آس بھی جس کی لوٹ گئی

تم نزع میں دیکھ کے آئے ہو ہم دفن کئے آتے ہیں اُسے

کچھ تم کو خبر ہے کتنی دُور اک جاتی دنیا چھوٹ گئی

اے دوست ترے جلنے والے جلتے ہیں کیسی مصیبت سے

دوزخ کی بھڑکتی آگ اُن پر سو مرتبہ چھاتی کوٹ گئی

دنیا میں ہیں اور بیٹھے ہیں کھڑاگ محبت کا لے کے

کیا اپنی بھی مت ماری گئی کیا ساری سُدھ بُدھ چھوٹ گئی

انصاف کسی کا کیا چاہیں کیا عشق کی رسم نرالی تھی

جو اپنے ساتھ کسی نے کیا اے مالک قسمت پھوٹ گئی

ہمراز نہیں دمساز نہیں، اللہ کوئی آواز نہیں
کیا عشق کی دنیا میں آتے ہی رہتی دنیا چھوٹ گئی

ہے دردسا درد محبت کا ہے چوٹ سی چوٹ محبت کی
آنکھیں کبھی نہ پڑنے پائی تھیں اور منھ پہ ہوائی چھوٹ گئی

متوالے ہوش میں رہتے ہیں یہ بھید اس وقت کھلا ہم پر
وہ مست آنکھ دل کی محفل جب ایک نظر میں لوٹ گئی

محشر کا دن جب ڈوب چلا انگڑائی لے لے کے اٹھے
اُن آنکھوں کے اے متوالو نیند اتنی جلدی ٹوٹ گئی

آگے شاید پڑتا ہے عدم کچھ ٹھیک ہمیں معلوم نہیں
یہ درد کی حد ہے فراق یہیں سے دل کی بستی چھوٹ گئی

۸۳

۱۹۳۶ء

بحثیں چھڑی ہوئی ہیں حیات و ممات کی

سو بات بن گئی ہے فراقؔ ایک بات کی

سازِ نوائے دردِ حجاباتِ دہر ہیں

کتنی دکھی ہوئی ہیں رگیں کائنات کی

رکھ لی جنھوں نے کشمکشِ زندگی کی لاج

بیدردیاں نہ پوچھئے ان سے حیات کی

یوں فرطِ بیخودی سے محبت میں جان دے
تجھ کو بھی کچھ خبر نہ ہو اس واردات کی

ہے عشق اِس تبسمِ جاں بخش کا شہید
رنگینیاں لیے ہے جو صبحِ حیات کی

چھیڑا ہے دردِ عشق نے تارِ رگِ عدم
صورت پکڑ چلی ہیں نوائیں حیات کی

شامِ ابد کو جلوۂ صبحِ بہار دے
روداد چھیڑ زندگیِ بے ثبات کی

اس بزمِ بیخودی میں، وجود و عدم کہاں
چلتی نہیں ہے سانس حیات و ممات کی

سو درد اک تبسمِ پنہاں میں بند ہیں
تصویر ہوں فراقؔ نشاطِ حیات کی

دیارِ عشق سے آیا کفر و ایماں کی حدیں چھوٹیں
یہیں سے اور پیدا کر خدا و اہرمن سوتی!

۸۴

سنہ ۱۹۳۶ء

جہاں شناس بھی دنیا سے بے نیاز بھی ہے
کہ عشق رازِ جہاں بھی جہانِ راز بھی ہے

شریک کیفیتِ غم نگاہِ ناز بھی ہے
پیامِ یاس بھی دیتی ہے دلنواز بھی ہے

پیامِ کیفِ عدم نغمۂ مجاز بھی ہے
نوائے ساز صدائے شکستِ ساز بھی ہے

خبر بھی ہے کہ نہیں تیرے نازِ بے جا کو
نیازِ عشق سنا ہے کہ بے نیاز بھی ہے

حیات ہو کہ اجل سب سے کام لے غافل
کہ مختصر بھی ہے کارِ جہاں دراز بھی ہے

خلوصِ ناز پہ، معصومیِ ادا پہ نہ جا
کہ اس کی فطرتِ سادہ کرشمہ ساز بھی ہے

مزاجِ حسن کبھی خود شناس ہو نہ سکا
کچھ اختلاطِ نہاں بھی کچھ احتراز بھی ہے

یہ غزنوی کی پریشاں خیالیاں تسلیم
کچھ اُلجھنوں میں مگر گیسوئے ایاز بھی ہے

پڑے ہوئے ہیں جو تمیزِ ہوش و مستی میں
کچھ اُن سے کہنے کو وہ چشمِ نیم باز بھی ہے
کچھ ایسی بات نہ تھی جس سے اتنی بات بڑھی
زباں دراز بہت وہ سکوتِ ناز بھی ہے
ارے یہ مست نگاہی یہ احتیاطِ نظر
سیاہ کار ہے وہ آنکھ پاکباز بھی ہے
نہ پوچھ اہلِ تمنا کے اضطراب و سکوں
کہ بے اثر ہے محبت اثر کا راز بھی ہے
ہر اک کے زخمِ جگر میں اک اور عالم ہے
قتیلِ حسنِ حقیقت غمِ مجاز بھی ہے

لئے ہے عشرتِ نظارہ کیف وجدانی

یہ رنگ و بوئے جوانی نوائے راز بھی ہے

عجیب کشمکشِ ہوش و بیخودی ہے فراقؔ

کہ مختصر بھی شبِ ہجر ہے دراز بھی ہے

رباعی

تو ہر لحظہ کچھ اور آتا ہے نظر

ہر جلوہ ہے پچھلے جلوے سے نازک تر

ہر خطِ بدن میں جذب نغمے جیسے

سوتی ہیں حقیقتیں لبِ شاعر پر

(مطبوعہ سیلی برقی پرس الہ آباد)